بند
لبوں
کی
چیخ
طاہر نقوی

بند لبوں کی چیخ

طاہر نقوی

ادارۂ ممتاز مطبوعات
۳۶۳/۱۸ فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

اشاعت اوّل ۔ ۱۹۸۲ء
تعداد ۔ ۔ ایک ہزار
ناشر ۔ ۔ ۔ عابد رضا ۔ ذیشان رضا
انتخاب اور ترتیب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ممتاز طاہر
کتابت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایس ٹی ایچ نقوی
سرِ ورق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیاقت حسین
مطبع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابنِ حسن آفسٹ پرنٹنگ پریس کراچی
قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۰ روپے

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان
کے تعاون سے اور اس کے
"پہلی تصنیف پروگرام" کے
تحت شائع ہوئی۔

اپنی اماں کے نام

جنھوں نے پہلے مجھے انسان
کی کہانی سُنائی اور پھر
اسی کہانی کو لکھنے کی
ترغیب دی۔

ترتیب

پیش لفظ

تخلیق کار اپنی تخلیق کا پہلا قاری ہوتا ہے۔ یہی قاری اسے اپنی تخلیق کو منظرِ عام پر لانے کے لئے اُکساتا ہے۔ افسانے کے معاملے میں یہ بڑا ظالم بن جاتا ہے اور کوئی رعایت نہیں کرتا، ایسا کرنے میں یہ حق بجانب بھی ہوتا ہے کیونکہ افسانے کی صنف ذہانت، تجربے کی پختگی، مشاہدے کی گہرائی اور بیان کی سچائی کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس صورت میں افسانہ زندگی کی حقیقتوں کو لے کر معصومیت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور خود پڑھنے والا افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ سانس لیتا ہے۔ افسانہ نگار ایسے لمحوں کی گرفت میں رہتے ہوئے آخر کار ان کا حصّہ بن جاتا ہے۔ میرا ذہن جب اس گرفت میں آتا ہے تو میں اپنے اردگرد بکھرے ہوئے افسانوں کو اپنے ذہن کے محدب عدسے سے دیکھ کر انھیں چُن لیتا ہوں اور غیر متعلق تفصیلات نکال کر انھیں علیحدہ رکھتا جاتا ہوں۔

بند لبوں کی چیخ

کسی بُت تراش سے جب پوچھا گیا کہ تم بُت کیسے تراش لیتے ہو تو اس نے یہی جواب دیا تھا کہ یہ بُت پتھر کے اندر پہلے سے موجود ہیں، میں تو انھیں صرف بیدار کرتا ہوں۔ ایسے کردار جن پر مصلحتوں یا مجبوریوں کا خول چڑھا ہوا ہوتا ہے ــــ ان کے خیالات کھلے آسمان کو دیکھنے کی تمنا میں سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اس کتاب کا نام محض کسی افسانے کے کسی کردار کی کیفیت ہی نہیں بلکہ یہ اس دور کے ہر فرد کا مسئلہ ہے۔ ایسی صورتِ حال میں انسان کی آنکھیں اُبل آتی ہیں، چہرہ لال ہو جاتا ہے، جسم پھٹنے لگتا ہے اور کانوں میں گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔

افسانہ نگاری میں نے محض دیکھا دیکھی نہیں اپنائی، شوق کی حد سے نکل کر افسانہ اب میری ذہنی ضرورت بن گیا ہے۔ اس لئے جدید، علامتی، تجریدی یا روایتی افسانے کی بحث کو پسِ پشت ڈال کر اُس لمحے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے اس کے زیرِ اثر میں افسانہ لکھتا ہوں۔ میری ذات میرے شعور سے گھلنے ملنے کے بعد جب لاشعور سے اُتر کر میرے ذہن میں داخل ہوتی ہے تو افسانے میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ ایک کیمیاوی عمل ہوتا ہے جو میرے لئے غیر اختیاری ہوتا ہے۔ اس طرح موضوع اپنے اظہار کے واسطے مناسب الفاظ ساتھ لئے ذہن سے باہر آتا ہے اور افسانہ اپنے فطری انجام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد افسانے کی جو شکل اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ خود اپنا فارم بناتی ہے۔ افسانے کی تخلیق کی یہ کیفیت مجھے کرب آمیز آسودگی دیتی ہے۔ لیکن وہ لمحہ میرے لئے عزیز تر ہوتا ہے جب میرا کوئی بچہ شور مچاتا ہوا آئے اور مجھ سے لپٹ جائے۔ چاہے اس وقت میرے چاروں طرف تنا ہوا تخلیقی کیفیت کا جال ٹوٹ ہی کیوں نہ جائے۔

جس لکھنے والے کے پاس خیال نہیں ہوتا، ہوتا ہے تو نحیف، وہ پڑھنے والے

کو الفاظ میں اُلجھانے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔ جب تک خیال ذہن میں واضح نہ ہوگا بیان میں اعتماد پیدا نہیں ہوگا۔ خیال کے ساتھ لفظ خود بخود ڈھلنے لگتے ہیں اور خیال کی غیر موجودگی میں الفاظ دھوکا دے جاتے ہیں۔ لفظ، خیال تک پہنچنے کے لئے محض سہارا بنتے ہیں۔ ہاں موضوع میں جان ہو تو بیان مددگار ضرور ثابت ہوتا ہے۔ واضح موضوع نہ ہونے کی صورت میں افسانہ الفاظ کی بے ترتیبی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ خیال کے بغیر افسانہ بے روح جسم ہوتا ہے اور جسم تو روح کی جائے پناہ ہے۔ میں خیال کو لفظوں کی چٹان سے باندھنے کی ارادی کوشش ہرگز نہیں کرتا، اس کی مجھے ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ یہ لفظ اور یہ خیال پیدا ہوتے ہی گھٹی کے ذریعے میرے اندر سرایت کر دیئے گئے تھے اور اس کے بعد ان کی شکل میرے شعور میں واضح ہوتی چلی گئی اور میرا شعور نکھرتا چلا گیا۔

مجھے اپنے الفاظ اور خیال کا اعتبار باہر سے بھاگتی ہوئی زندگی سے بچ کر پھولتی سانسوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے وقت، وہاں موجود بھرپور شفقت سے آج بھی اُسی طرح حاصل ہوتا ہے مگر اُس ہستی کو نہ پاکر جس کی آنکھوں سے معبود کا نور ممتا کی صورت میں ٹپکتا تھا، اب یوں لگتا ہے جیسے میرا خدا آسمان پر واپس چلا گیا ہے اور اُس لمحے آنے والے "روز حشر" کا، جب میں اُن ہی کے نام سے پہچانا جاؤں گا، سارا منظر میری نظروں میں سما جاتا ہے۔ یہ افسانہ میری اسی حالت کا پرتو ہے۔

میرا پہلا باقاعدہ افسانہ جس کے ذریعے میرا غائبانہ تعارف اُس لڑکی سے ہوا جو اب میری بیوی ہے اور جو ۱۹۶۹ کے برس ایک کثیر الاشاعت پرچے میں چھپا، وہ مجھے اب بھی اچھا لگتا ہے۔ اس سے قبل میں بہت سے کچے کچے افسانے

مختلف رسالوں اور اخباروں میں لکھ چکا تھا جنھوں نے میرے اچھے افسانوں کے لئے زمین ہموار کی۔ دوسرا افسانہ ۱۹۷۰ میں افکار میں چھپا۔ اس کے ساتھ ہی جب میں نے ادب کی اس سب سے کٹھن صنف افسانے کی راہ پر اپنا سفر شروع کیا تو لفظ توانا ہو کر میرے خیال کو مزید نکھارنے لگے اور میرے لئے کوئی کردار، کوئی منظر، کوئی موڑ اجنبی نہیں رہا۔ زندگی کے مختلف موڑ، مناظر اور ہمارے قریب کے ایسے ہی جانے پہچانے کرداروں کے افسانے اس کتاب میں شامل ہیں جو ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۲ء کی پہلی سہ ماہی تک وقتاً فوقتاً مختلف ادبی پرچوں میں چھپتے رہے ہیں۔ اس دوران میرے افسانوں کے موضوعات اور لہجے میں تنوع رہا ہاں آپ ان افسانوں کے موضوعات کی نزاکت محسوس کریں گے۔ یہ نزاکت بیان کی حفاظت میں اس کے سائے تلے آگے بڑھتی ہے۔

اس سفر کے دوران جب میں آگے چل کر اوراق کی منزل پر پہنچا تو ڈاکٹر وزیر آغا نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا، میری ذہنی تربیت کی اور ہر بار مجھے نئی راہ سجھائی۔ اسی طرح پروفیسر مجتبیٰ حسین کی رہنمائی کی وجہ سے میرے اندر مزید بھروسہ پیدا ہوا اور پروفیسر صاحب نے میرے ذہن میں بیٹھے ہوئے افسانہ نگار کی عملی رہنمائی فرما کر اسے اب تک چاق و چوبند رکھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، موضوع کی حقیقت نہ ہو تو بیان کے چوکھٹے میں خالی پن کی اذیت کا احساس اُبھرتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے میرے اس احساس کو ختم کر کے میرا اعتماد اُبھارا اور سب سے پہلے مجھے اپنے افسانوں کا مجموعہ چھاپنے کی ترغیب دی۔ اسی لئے اس بھاگتے ہوئے شہر میں ڈاکٹر کشفی کی شخصیت میرے واسطے ایسی ہی ہے جیسے تیز دھوپ میں کنارے کنارے پیدل چلنے والے کو کوئی ہاتھ کھینچ کر اپنے ساتھ اپنی آرام دہ سواری میں بٹھا لے اور اب اسی سواری میں بیٹھا میں اس وقت سوچ

رہا ہوں کہ بصورتِ دیگر، وقت کی راکھ مجھ پر گر کر راستے کو دھندلا دیتی اور اس راکھ میں میرے اُسی ابتدائی شوق کی چنگاری دبی رہتی۔

اس مرحلے پر میں اکادمی ادبیات پاکستان کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔ اس دَور میں جبکہ قدم قدم پر تعلقات اور سفارشوں کی ضرورت پڑتی ہے، اس فعال ادارے نے محض میرے ان افسانوں کو سفارش سمجھا۔ ورنہ یہ کتاب کم از کم اس وقت ہرگز سامنے نہ آتی۔ ہاں چھپتی ضرور مگر معلوم نہیں کب۔

کراچی — طاہر نقوی

کُھرنڈ

ادھر اُدھر سے میری طرف رینگتے ہوئے لمحوں کے سرسراتے کیڑے میری آنکھوں میں گھس گئے اور میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے ٹٹولتے ہوئے سوئچ پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا وہ آن تھا مطلب بجلی روشن تھی۔ یہ اندھیرا میرے اردگرد خود میرے تانے ہوئے حصار کو توڑ کر میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں اُتر گیا، پھر یہی دُھواں غیر محسوس طریقے پر میرے دل سے دستک کی آواز بن کر اُبھرنا شروع ہو گیا۔ یہ دستک میرے وجود کے کونے کونے سے ہوتی ہوئی میرے ذہن میں آ کر ٹھہر گئی۔ میں نے ذہن کو اُدھر سے ہٹانے کی کوشش میں جھنجھلا کر سر کو جھٹکا دیا تو یہ دستک میرے ذہن کی سطح سے گیند کی مانند اُچھل کر دروازے پر جا گری۔ میں اخبار پھینک کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک اَن دیکھا مفہوم میرے اوپر، ہر چیز پر، اس کمرے میں تن گیا۔ دروازے پر دستک کی آواز رفتہ رفتہ بلند ہوتی رہی۔ ایسے لمحوں

میں کبھی ذہن میں بیٹھے بے چین پرندے کی پرواز نہیں ٹھہرتی۔ لمحے مسلح تھے اور میں نہتا اور تنہا دُنیا کی بھیڑ میں گم دوسروں کی نفرتوں کے انگارے اپنی جھولی میں بھر رہا تھا جنکی تپش اب میرے اعصاب سے ہوتی ہوئی جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ بھاپ سارے کمرے میں پھیلنے لگی۔ دستک کی یہ آواز میرے بدن میں تھکن کی طرح اُترتی جا رہی تھی۔ خیالات کے پرندے ذہن سے اُڑ کر گزرے لمحوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہُوئے۔ کونے کھدروں میں پڑی خاک میں اَٹی یادیں آنے لگیں۔ میں نے آنکھوں کے غار بند کر کے ذہن کا دریچہ کھول دیا۔ مختلف کردار سرگوشیوں کی مکڑیاں بن کر میرے ذہن کے جالے سے ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ اپنے عمل کو یادوں میں سمونے کا مجرم میں خود ہی ہوں۔ ضمیر میں بجھے ہُوئے کوئلے پھر سُلگ پڑے۔ میں نے اپنے آپ کو اپنے وجود میں محصور کر لیا اور اپنے وجود کے گہرے اندھیرے غار سے ہانپتا گزرتا اپنے بے کفن ضمیر کے سامنے آ کھڑا ہُوا۔

یہ دستک انور کی سی تھی اس کے ساتھ ہی مجھے شاہدہ کے خیال نے آگھیرا۔ شاہدہ کو میں نے ورغلا کر انور سے بدظن کر دیا تھا۔ اس کے بعد انور مجھے کہیں نہیں ملا تھا۔ شاہدہ مجھ پر اعتماد کرنے لگی اور میں اس کی دولت لٹاتا رہا۔ جب وہ اس سے اپنا ہاتھ کھینچنے لگی تو میں نے اُسے اس طرح چھوڑ دیا جیسے اُس سے کبھی واقفیت ہی نہ تھی۔ وہ روتی رہی مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس وقت دستک یہ دونوں ہی دینے لگے تھے۔ گھڑی کی آواز ذہن سے ٹکرانے کے بعد اُچھل اُچھل کر چاروں طرف فضا میں بہنے لگی اور اسی ٹک ٹک سے سیما کا چہرہ نمودار ہونے لگا۔ اس کی بے قرار طبیعت اسی طرح کی بے ترتیب اور تیز دستک دیا کرتی تھی۔

سیما ایک ماڈرن اور اونچے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر ہمیشہ ایک جنسی کشش ناچتی رہتی تھی جس کی وجہ سے میں بے خودی میں اس کی طرف کھنچا چلا گیا

اور اس کو رام کرنے کے لئے میں نے ہر جا و بے جا طریقہ اختیار کیا۔ اچانک میرے وجود میں تیز ہوا چلی اور میرے اندر سے انسانیت کو لے اڑی۔ اس کے بعد ادھر ادھر اڑتی ہوئی شوخ اور بے پرواہ تتلی محصور ہو کر رہ گئی۔ اس کی ساری تیزی جاتی رہی۔ وہ میرے سامنے روتی منتیں کرتی مگر میں اُسے دلاسے دیتا رہا۔ ہر لڑکی اپنے دل تک پہنچنے کے لئے ایک چور دروازہ رکھتی ہے جس میں سے کوئی بھی مرد گزر سکتا ہے۔ شاہدہ اور سیمانے میرے واسطے وُہی چور دروازہ کھول دیا تھا۔ میں اُچھلتا کودتا اس سے گزر کر ان کے دل تک پہنچا مگر دبے پاؤں خاموشی سے ایک روز انہیں تنہا سسکنے کے لئے چھوڑ آیا۔ پھر کئی لوگ ایک ساتھ دستک دینے لگے۔ یہ میرے دفتر کے ماتحت معلوم ہوتے تھے جن کو میں نے ہمیشہ ناجائز دبایا، جن پر سختیاں کیں، اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کیا۔ اپنے ہی ایک ساتھی کے خلاف اپنے افسر کو ورغلا کر اور خوشامد درآمد کے بعد ترقی حاصل کر لی تھی مجھے ان تمام دفتر والوں کے چہرے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ دن کے اُجالے میں اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے وقت یہی احساس رہتا ہے کہ یہ مجھے پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ پھر یکایک میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے وہ دن یاد آنے لگا جب میری ان حرکتوں کی وجہ سے میرے ماں باپ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں اپنی ماں کے آنسو دیکھتا رہا مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میرے وجود کے اندر سے وقت کا پرندہ اُڑ گیا تھا جو محبت اور ممتا ایسے جذبوں کے لئے کبھی نہیں ٹھہرتا۔ ماں باپ کے پُرسکون اور ٹھنڈے سائے کو چھوڑ کر میں خود ہی زندگی کی تپتی دھوپ میں نکل آیا تھا۔ ان کے حق کو حق نہ سمجھا، چھوٹے بہن بھائیوں کو ان کا حق نہ دیا۔ ان کے خیال کے ساتھ ہی مجھے دروازے پر ہلکی نرم دستک سنائی دینے لگی۔ ہر بار دستک پر میں اُٹھتا مگر کچھ سوچ کر بیٹھ رہتا کیونکہ ہمت نہیں تھی کہ دروازہ کھول کر اپنا

یہ چہرہ ان سب کو دکھاتا۔ یہ سارے کردار میرے جسم کے تاریک غاروں سے نکلتے ہوئے بھیڑیوں کی طرح میرا پیچھا کر رہے تھے۔ انور مجھے ایسی نظروں سے دیکھے گا کہ میں سنبھل نہ پاؤں گا۔ شاہدہ مجھے پتہ نہیں کیا کیا کہے گی۔ سیما کے سامنے نظریں نہ اٹھا سکوں گا۔ ممکن ہے کہ اس جیسی لڑکی مجھ پر جھپٹ پڑے۔ دفتر والے سب مل کر مجھ پہ حملہ آور ہو جائیں گے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کا خیال آتے ہی میں دروازے کی طرف لپک کر گیا اور کھولنے ہی والا تھا کہ جھجک کر رہ گیا۔ ابّا کی غصیلی نظروں سے خوفزدہ ہو گیا۔ اماں اور بہن بھائیوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ میرے اعمال کے ثمرات میرے وجود کے درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے کیونکہ ان میں میرے اندر کا سڑا ہوا مادّہ جمع ہو گیا تھا۔ وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس کے لمحے یوں گزر رہے تھے جیسے سانپ سوکھی گھاس میں سرسرا رہے ہوں۔

دستک ہوتی رہی۔ یہ دستک میرے اعصاب پر بُری طرح چھا گئی تھی۔ ہاتھ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھتا اور رک جاتا۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ باہر ایک ہجوم کھڑا ہو گا جو مجھے بھنبھوڑ ڈالے گا، میری زیادتیوں کا بدلہ لے گا، سب مجھ سے اپنا اپنا حق مانگیں گے، فریاد کریں گے، کفارہ طلب کریں گے۔ زندگی کا ہر ہنگامہ وقت کے سمندر میں کھو جاتا ہے مگر اب یہ سارے ہنگامے وقت کے سمندر سے دوبارہ ابھر ابھر کر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتے تھے۔ ان کی نفرتوں کی سیاہ لہریں میرے چہرے پر ابھر رہی تھیں۔ میرے پیچھے لپکتی ہوئی ساعتوں نے آپس میں تحلیل ہو کر میرے وجود کے گرد عجیب سا موہوم حلقہ بنا لیا تھا۔ میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا کہ بیوی نے اندر سے آ کر حیرانی سے پوچھا۔

"یہ دروازے پر کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟"

"دستک!" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دستک؟"

"ہاں بہت دیر سے" میں بوجھل لہجے میں بولا۔

"تو پھر کھولتے کیوں نہیں"

"نہیں!" میرے حلق سے آوازیں نکل کر آپس میں اُلجھ گئیں۔

"ارے" اُس نے پریشانی سے کہا۔ "بھئی باہر پتہ نہیں بے چارہ کون ہوگا"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چُپ رہنے کو کہا تو وہ جھینک اُٹھی۔

"آخر کیوں جی"

میں اُسے پکڑ کر اندر لے آیا کہ کہیں اس تکرار سے میری آواز باہر نہ چلی جائے۔ دستک کی آواز مجھے برابر قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ میں زندگی میں اب تک اپنے سر پر ظاہر داری کا چراغ جلائے سرپٹ بھاگتا رہا تھا —

"میں دیکھتی ہوں —" بیوی نے مشکوک نظریں مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں اُسے روکتا رہا۔ دبی دبی اور گھٹی گھٹی آواز میں منع کرتا رہا لیکن اس نے دیکھتے ہی دیکھتے جا کر دروازہ کھول دیا، باہر کھڑے ہجوم کے تصور سے میں کانپ گیا۔ اس لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا اور اب حلق سے دل کے دھڑکنے کی تیز آواز آنے لگی۔ باہر دیکھ کر بیوی بولی۔

"ارے یہاں تو کوئی بھی نہیں —"

"کوئی نہیں؟"

میں یقین کرنے کے لئے مشکوک لیکن بھاری قدموں پر اپنے آپ کو لادے آگے

بڑھا۔ یہ ساعتیں ایک دوسرے میں گھلی ملی میری آنکھوں کے راستے میرے وجود کے اندر چاروں طرف بہہ نکلی تھیں۔

"تمہیں وہم ہوا ہوگا ــــ"

یہ کہہ کر بیوی پھر کسی کام میں لگ گئی۔ میں آگے بڑھا اور ادھ کھلے دروازے سے گردن نکال کر لرزتے جسم اور دھڑکتے دل کے ساتھ باہر جھانکنے لگا پھر اندر واپس آنے کی بجائے میں باہر ہی نکلتا چلا گیا۔

رات گئے جب میں واپس آیا تو گھر میں داخل ہوتے وقت میں جو ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اب دوبارہ مجتمع ہو گیا۔ بیوی نے دیکھتے ہی فکرمندی سے پوچھا

"کہاں چلے گئے تھے؟ اتنی دیر لگا دی۔"

اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے سب سے پہلے میں نے گھر کی ساری کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے۔ بیوی تعجب سے کھڑی دیکھتی رہی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا، باہر کوئی بھی نہیں ــــ"

ــــ:(※):ــــ

کھلی فضا کی گھٹن

ہڑبڑا کر میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنی بیوی کا بستر خالی پایا۔ تکیے کے نیچے ٹٹول کر ہاتھ کی گھڑی دیکھی اور بستر سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک دم جھنجھلا اُٹھا کہ جب وہ خود اُٹھی تھی تو ساتھ ہی مجھے کیوں نہ جگا دیا۔ سب سے پہلے مجھے شیو بنانا تھی اسلئے میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا میرے پیچھے میری بیوی آ کھڑی ہوئی۔ میں نے بغیر مڑے اس سے پوچھا:

"تم نے میری پتلون استری کر دی تھی ؟"

کوئی جواب نہ پا کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ وہاں نہ تھی لیکن مجھے یہی احساس رہا کہ کوئی میرے پیچھے ہی کھڑا ہے۔ میں نے اس احساس کو دفتر کے لئے دیر ہو جانے کی وجہ سے اپنی گھبراہٹ پر محمول کر کے کوئی اہمیت نہ دی۔

گھر سے جب میں باہر نکلا تو مجھے دوبارہ دروازہ کھُل کر بند ہونے کی آواز آئی۔ میری بیوی ہمیشہ مجھے جاتے ہُوئے خدا حافظ کہتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اسی لمحے یوں لگا جیسے کوئی جلدی جلدی قدم رکھتے ہوتے مجھ تک پہنچ گیا ہے راستے میں متواتر یہی محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ رکشے میں مجھے یہی احساس رہا جیسے سیٹ پر ایک اور آدمی بھی بیٹھا ہو۔ دفتر کی سیڑھیوں پر کوئی میرے ساتھ ساتھ چڑھتا رہا۔ دفتر کے اندر بھی وہ میرے پیچھے پیچھے داخل ہو گیا۔ جاتے ہی میں اپنی کرسی میں دھنس گیا اور آرام کے خیال سے آنکھیں بند کر کے سر کرسی کے پیچھے ٹکا دیا کہ شاید یہ گھبراہٹ ختم ہو جائے مَیں نے سوچا کہ اس کے بعد یہ احساس بھی جاتا رہے گا پھر مَیں نے سگریٹ سُلگا لیا عین اسی وقت دروازہ کھُلا اور بند ہو گیا میں نے آنکھیں کھولیں تو کوئی نہ تھا۔ مَیں نے فوراً چپراسی کو بُلا کر پوچھا:

"ابھی ابھی تم نے دروازہ کھولا تھا؟"

اس نے نفی میں جواب دیا "صاحب مَیں تو باہر ہی بیٹھا ہوں کسی نے دروازہ نہیں کھولا؟"

وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں اور منتشر ذہن کو یکجا کرنے لگا۔ اسی لمحے پھر دروازہ کھُلا۔ مَیں نے اس بار آنکھیں نہیں کھولیں لیکن جی چاہ رہا تھا کہ آنکھیں کھول کر دیکھوں۔ مَیں نے اپنے پپوٹوں کو سختی سے بند کئے رکھا۔

"صاحب!"

مَیں ہڑبڑا کر کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا اور آنکھیں کھول دیں، پھر چپراسی کو سامنے دیکھ کر خفت مٹاتے ہوئے کہا:

"اچھا تم ہو۔"

وہ میری اس حالت پر اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے" میری آواز میں گھبراہٹ تھی۔

"بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں کرسی سے اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے وزن ہٹنے سے اسپرنگ اُٹھ جاتا ہے اور بجلی کی سی تیزی سے بڑے صاحب کے کمرے کی طرف اس خیال سے چل پڑا کہ شاید یہ احساس میرے ساتھ ساتھ نہ جائے، پیچھے رہ جائے۔ مگر جب میں بڑے صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے لگا جیسے دروازہ ایک مرتبہ پھر کھل کر بند ہوا ہے۔ میں نے غیر ارادی طور سے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر کوئی نہ تھا۔ میری پیشانی پر پسینے کی بوندوں کی وجہ سے ٹھنڈک سی پیدا ہو گئی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی پھر احساس ہوا کہ جیسے میری کرسی کے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ میں نے نہ چاہنے کے باوجود مڑ کر دیکھا میرے سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔ بڑے صاحب نے پہلے تو تعجب سے مجھے دیکھا مگر نظر انداز کرتے ہوئے ایک فائل میری طرف بڑھا دی اور کہا:

"اس کیس کو آج ہی نمٹانا ہے۔"

فائل ہاتھ میں پکڑنے سے پہلے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے کسی اور نے اسے تھام لیا ہو، فائل دھماکے سے فرش پر گر پڑی۔ میں نے گھبرا کر فائل اُٹھائی اور صاحب کی طرف دیکھا وہ مجھے مسلسل تعجب سے دیکھے جا رہے تھے۔

"یہ دھماکے کی آواز کیسی؟" میں نے صاحب سے یقین کر لینے کے لئے پوچھا:

"جائیے جائیے آپ کچھ پریشان ہیں۔"

چھٹی کے بعد گھر جاتے ہوئے گھڑی گھڑی یہی گمان رہا کہ کہیں میں بے خیالی اور بے دھیانی میں اپنے ساتھ چلنے والے سے ٹکرا نہ جاؤں اس لئے محتاط انداز میں سنبھل کر چلنے لگا۔ جو احساس میرے ذہن میں غیر محسوس طریقے سے آبیٹھا تھا، اب اس میں خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔ میں خوف سے اپنے اردگرد دیکھتا، وہاں حسب معمول کوئی نہ ہوتا مگر گھر تک کوئی میرے ساتھ ساتھ ہی چلتا رہا۔

گھر پہنچا تو بیوی نے میرے چہرے کو فکر مندی سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔ میرے منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے میرے سامنے کھانا رکھ دیا۔ مجھے یہ احساس برابر رہا کہ کوئی میرے ساتھ کھانا کھا رہا ہے۔ جب وہ پانی لے کر آئی تو کھانا ختم ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود مجھے بھوک کا احساس رہا۔ میں نے بیوی سے مزید کھانا لانے کو کہا تو وہ مسکرائی، کہنے لگی۔

"تو آپ بھوک کی وجہ سے پریشان تھے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھانے کے بعد مجھے یہی احساس رہا کہ میں ابھی بھوکا ہوں زیادہ کوئی اور ہی کھا گیا ہے۔ میں نے مزید کھانے کے لئے بیوی سے نہیں کہا اور لیٹ کر اخبار دیکھنے لگا۔

رات کو جب میں اور بیوی سونے کے لئے لیٹے تو میرے ہونٹوں کے نیچے کانٹے سے اگ آئے میری بیوی جلدی ہی سو گئی لیکن مجھے یہی احساس کھائے جا رہا تھا کہ سونے کے کمرے میں بھی کوئی ساتھ ساتھ ہی ہے۔ میں نے یہ گوارہ نہ کیا اور دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ بیوی نے صبح اٹھ کر اس کی وجہ پوچھی تو میں کوئی مناسب جواب نہ دے سکا میرا جی چاہا کہ بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر پیار کر لوں اور رات بھر کی بے چینی دور کر ڈالوں مگر یہ سچ

کر رک گیا کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔ میری بیوی میری آنکھوں کو دیکھ کر میرے ارادے کو بھانپ گئی۔ مگر مجھے ہچکچاتے ہوئے دیکھ کر کسی اور کام میں لگ گئی۔ پھر جب میں اسے پیار کئے بغیر دفتر جانے لگا تو اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔۔۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کچھ بدل گئے ہیں۔۔"

میرا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا اور میں ہکلا کر رہ گیا۔ پھر یہ احساس لئے کہ میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے، دفتر چل دیا۔

گھر میں میری اس کیفیت کو دیکھ کر میرے ماں باپ اور میری بیوی فکر مند اور متعجب ہوتے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میری بیوی نے کسی نفسیاتی ماہر کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن اس نے صرف آرام کرنے کا مشورہ دیا اور چند ٹانک دیئے مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سب لوگ میری موجودگی میں آپس میں اشاروں سے باتیں کرتے، میں یہ سب کچھ دیکھتا اُن کے اندیشوں کو مضحکہ خیز قرار دیتا اور ہنسنے کی کوشش بھی کرتا۔ میری یہ گھبراہٹ، پریشانی اور بے چینی گھر سے باہر دفتر والوں سے بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ میرے بے تکلف دوستوں نے میری اس حالت کے بارے میں مجھے کریدنے کی بھی کوشش کی مگر میں ان کے جواب میں چونک پڑتا جیسے کوئی وحشت زدہ خواب دیکھ کر چونک اُٹھتا ہے۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے ہکلا کر کہتا۔

"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ ٹھیک ہوں میں۔۔"

مگر میرے اس جواب سے کوئی مطمئن نہ ہوتا۔ بڑے صاحب نے مجھے قصداً اپنے پاس بٹھا کر میری اس حالت کی وجہ پوچھی لیکن الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے پاس ہی کوئی بیٹھا ہے وہ میری ساری باتیں سن لے گا۔ میرے چہرے پر پسینہ آ گیا اور ہونٹ

لرزنے لگے میں معذرت کر کے وہاں سے اٹھ آیا۔ وہ مجھے جاتے ہوئے تعجب اور فکر مندی سے دیکھتے رہے۔

میرے ذہن اور حواس پر چھپے ہوئے اس احساس میں کہ میں اب اکیلا نہیں ہوں، پہلے دن کے بعد سے روز بروز شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی یہ احساس ایک جلتے ہوئے کوئلے کی طرح میرے دل میں دہک رہا تھا اور اس سے چنگاریاں اڑ اڑ کر میرے حواس اور پورے جسم پر پڑ رہی تھیں میں نے اپنے ساتھ والی شخصیت کو آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ صرف محسوس کیا تھا اس کو محسوس کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا کیونکہ وہ میرے اندر چھپا ہوا نہیں بیٹھا تھا۔ اپنے اندر چھپے ہوئے کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ شروع شروع میں مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ وہم ہو گیا ہے لیکن مجھے اپنے حواس پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ میں اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا کہ کوئی اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر لمحے میرے ہمراہ ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی ہے تو نظر کیوں نہیں آتا اور مادی جسم کیوں نہیں رکھتا۔ پھر سوچا ممکن ہے کوئی سایہ ہو اور سایہ ہے تو کس کا؟ لیکن میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا اور چپ ہی رہا۔ میری بیوی مجھ سے کہتی کہ کام اور مصروفیت کی وجہ سے ذہن تھک گیا ہے کچھ دنوں کی چھٹی لے کر آرام کرو لیکن مجھے معلوم تھا کہ آرام اور فرصت کے لمحات میں یہ احساس اور شدت اختیار کر جائے گا۔

ان دنوں موسم بھی اچھا تھا۔ بادل چھائے رہتے اور ٹھنڈی ہوائیں چلتیں۔ کبھی کبھار پھوار بھی پڑنے لگتی۔ ایسے موسم میں میرے اندر ہمیشہ اُمنگ پیدا ہوتی اور جی چاہتا کہ باہر نکل کر گھوموں پھروں مگر اب میں اپنے اندر موسم کی یہ فرحت محسوس کرتا تو میری رگ و ریشے میں کھچاؤ سا پیدا ہونے لگا تھا۔ اس احساس کو دور کرنے کے لئے میں کبھی اپنے سر کو جھٹکتا کبھی اپنی انگلیاں

چٹخاتا۔ بیوی میری طرف دیکھتی تو میں مسکرانے کی کوشش کرتا تاکہ وہ میری کیفیت کا اندازہ نہ لگاسکے۔

"ایسے موسم میں تو آپ ہمیشہ سمندر کے کنارے جانے کی ضد کرتے ہیں۔ آج نہیں چلیں گے"

میں بادلِ نخواستہ تیار ہوگیا۔ وہ خوش تھی کہ تفریح کے بعد میری یہ حالت نہیں رہے گی۔

سمندر کے کنارے بہت سے لوگ جمع تھے جو گھٹن کے ماحول سے بھاگ کر یہاں آگئے تھے۔ ہم دونوں جوتے اتار کے گیلی ریت پر ٹہلنے لگے۔ فرحت میرے پاؤں سے لے کر میرے ذہن تک پہنچ گئی مگر مجھے یوں محسوس ہوتا رہا کہ میرے ذہن میں جو پہلے ہی سے ایک احساس گھسا بیٹھا ہے وہ اس فرحت کو ذہن میں گھسنے سے روک رہا ہے۔ میری بیوی میرا ہاتھ کھینچتی ہوئی پانی میں لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ کوئی دوسرا ہاتھ مجھے مخالف سمت کھینچ رہا ہے۔ میرے ذہن میں مکھیاں بھنبھنانے لگیں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں وہ قہقہے لگارہی تھی میں بھی اس کے ساتھ قہقہے تو لگا رہا تھا مگر اندرونی طور سے خوف زدہ تھا کہ میرے ساتھ رہنے والا کہیں مجھے سمندر میں نہ ڈبو دے اس وجہ سے میں جلدی ہی پانی سے باہر آگیا اور بیوی سے بولا۔

"میں تمہیں دور سے دیکھتا رہوں گا۔"

سامنے ڈوبتے ہوئے سورج کی تمام اداس پیلاہٹ سمٹ کر میرے سُتے ہوئے چہرے پر اکٹھا ہوگئی تھی۔ اس کی ہنسی یکایک تھم گئی اور وہ میرے ساتھ ہی چلی آئی۔ وہیں مجھے چائے کی طلب ہوتی جب میں پیالی اٹھا کر گھونٹ لیتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میری ہی پیالی میں سے کوئی دوسرا بھی گھونٹ لے رہا ہے۔

"ایں۔۔۔ اتنی گرم چائے آپ نے فوراً ختم کردی۔۔۔" وہ تعجب سے بول اٹھی کیونکہ وہ جانتی

تھی کہ میں چائے ہمیشہ سکون اور اطمینان سے پینے کا عادی ہوں۔ چائے پینے کے بعد اس نے کنارے کنارے ٹہلنے کو کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور ساتھ ہو لیا۔ میں اب کم بولنے لگا تھا اور بولتا بھی تو اتنی دھیمی آواز میں جیسے سرگوشی کر رہا ہوں تاکہ میرے ساتھ بہنے والا نہ سن لے۔ ایک نامعلوم خوف کے بوجھ کے احساس سے ہر وقت میری روح دبی رہتی۔ میرے اندر ایک عجیب سا کھچاؤ تھا۔ اس احساس کی وجہ سے میرے اندر جذبات کے بہتے ہوئے دھارے کا شور وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر میری آواز سمندر کی لہروں کی گنگناہٹ میں ڈوب گئی، گلا خشک ہو گیا، آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ وہ میری یہ کیفیت دیکھ کر سنجیدہ ہو گئی اور ہم خاموشی سے واپس چل دیئے۔ اس وقت یہ احساس نوکیلی کرچیوں کی صورت میں میرے سینے کو چھلنی کئے دے رہا تھا۔

میں نے لوگوں سے ملنا جلنا اور کہیں آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا مگر ایک روز میری بیوی نے فلم دیکھنے کی فرمائش کی تو میں انکار نہ کر سکا اور حامی بھرتے ہوئے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ فلم کے دوران مجھے برابر یہی احساس رہا کہ کوئی دوسرا بھی میری سیٹ پر ہی بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے پورے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی میری بیوی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اسی احساس کی بنا پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو اس نے مجھے بے بسی سے دیکھا۔ میرے چہرے پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں تھیں میں سیٹ پر کسی دوسرے کی موجودگی کی وجہ سے جگہ تنگ ہونے کے احساس کے باعث بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ فلم کی بجائے میری اس کیفیت کو دیکھے جا رہی تھی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں چلیے چلیں۔" ہم فلم کے دوران ہی اٹھ آئے میں خود ذاتی طور سے بھی اپنے پاس کسی اور کے موجود ہونے کے اس احساس کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی ہر لمحے کوشش کرتا مگر جیسے جیسے میں اپنا دھیان مصروف رکھنے کی کوشش کرتا اس احساس

میں شدّت پیدا ہوتی چلی جاتی اور خوف سے ہم آہنگ ہو کر یہ احساس عجیب سی ڈراؤنی کیفیت پیدا کرتا رہتا۔ اس احساس کی تیز آنچ نے میرے جسم کو پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یوں لگتا جیسے مجھے اپنے وجود کی چہار دیواری سے باہر جھانکنے کی اجازت نہیں ۔ ذہن اور اس احساس کی کشمکش سے میری آنکھوں کے سامنے سائے پھیل جاتے۔ اس احساس سے وقتی طور سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں ایک روز شام کو لیٹے لیٹے ایک کتاب پڑھنے لگا۔ چند لمحوں سے زیادہ میں اپنا دھیان کتاب کی طرف نہ رکھ سکا اور لاشعور کی سیڑھیوں سے دھیان کی طرف آ کر اس احساس نے میرے ذہن کو پھر آدبوچا۔۔ صفحہ پلٹنے لگا تو یوں لگا جیسے کوئی دوسرا ابھی وہی صفحہ پڑھ رہا ہو اور مجھے صفحہ پلٹنے نہ دے رہا ہو۔ میں نے پڑھنا بند کر دیا اور کتاب میز پر دے ماری اس کے فوراً بعد مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کتاب کو اٹھا کر دوبارہ اسی طرح میز پر پھینکا۔ کیونکہ اسی طرح کی آواز پھر آئی۔ اس دوران میری سانس سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ میری نظروں کے سامنے میری بیوی کا چہرہ یک بار گی ابھرا اور میری روح پر چھا گیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میری بیوی جانے کب سے میری یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔ میرے پورے جسم میں اندرونی خوف سے لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ میری بیوی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ مجھے بے بس نظروں سے دیکھے جا رہی تھی اس کے آنسو دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں میں لے کر میرا دل بھینچ لیا ہو۔ میں تڑپ کر رہ گیا اور بے قابو ہو کر اسے اپنے بازوؤں میں بھرنے کے لئے لپکا لیکن دوسرے ہی لمحے اس خیال سے کہ کوئی دوسرا میرے پاس موجود ہے وہ یہ حرکت دیکھ لے گا میں رک گیا۔ میری بیوی نے میری اس حرکت کو پریشانی سے دیکھا اور آ کر اپنا سر میرے کاندھے سے ٹکا دیا۔ میں نے گھبرا کر اس کا سر علیحدہ کیا کیونکہ میں بالکل اپنے ساتھ ہی کسی اور کو کھڑے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے رو دینے والی بے بس نظروں سے دیکھا اور اپنے آپ کو صوفے پر گرا دیا۔ اسی وقت

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی وہ آنسو پونچھتی ہوئی اُس طرف دوڑی۔ وہیں سے پکار کر اس نے کہا ـــــ

"آپ کا فون ـــ"

میں نے پیشانی سے پسینے کی بوندیں ایک انگلی پر لے کر جھٹک دیں اور جا کر رسیور تھام لیا۔ کان کے نزدیک رسیور لے جاتے ہوئے یہی احساس پھر ابھرا کہ کہیں دوسری جانب وہی نہ ہو جو لمحہ لمحہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ حالانکہ ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا کان بھی رسیور کے پاس ہی ہے جس کے ہر لمحے ساتھ رہنے کا احساس ایسی حقیقت بن گیا تھا جو کانٹا بن کر میرے دل میں چبھتا رہتا تھا۔ میں نے اپنی رگوں میں خون کی گردش رکتی ہوئی محسوس کی۔ دوسری طرف انور تھا اس نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے نسرین کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ میری نظروں کے سامنے نسرین کا چہرہ ایک لمحے کے لئے ابھرا اور غائب ہو گیا جیسے ڈوبنے والے کا ہاتھ آخری بار ابھرتا ہے۔

رسیور رکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی قدم رکھتا ہوا مجھ سے دور جا رہا ہو۔ دروازہ کھل کر دوبارہ بند ہو گیا۔ میری بیوی میرے چہرے پر متغیر تاثرات دیکھ رہی تھی اس وقت میرے چہرے پر خوشی کی کیفیت دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے طویل سانس لیا جیسے ایک مدت کے بعد اب اپنی بیوی سے تنہائی میں ملا ہوں۔ میں بھی اپنی خوشی پر قابو نہ پا سکا اور اسے لپٹا لیا۔ اچانک اسی لمحے ایک کرب کی وجہ سے میں بلبلا اٹھا مگر میں نے بیوی کو علیحدہ نہیں کیا۔

میرے ضمیر میں اس احساس کی کوئی کرچ ابھی تک چبھی ہوئی تھی ـــــ !!!

ـــــ)·)·)·:·(·(·(ـــــ

بوجھ

جھلستی ہوئی دوپہر میں پسینے کے قطرے اس کے چہرے سے بہہ بہہ کر مٹی کی تہہ میں جذب ہو رہے تھے۔ کدال کو زمین پر رکھ کر اس نے ماتھے پر انگلی پھیری اور پسینے کے قطروں کو اپنی انگلی پر لے کر جھٹک دیا۔ جھکے جھکے اب اس کی کمر دُکھنے لگی تھی اسلئے اس نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ صرف دو چار مزدور کام میں مصروف تھے باقی چھپّر کے نیچے بیٹھے سستا رہے تھے۔ دُور تک پھیلا ہوا میدان تیز دھوپ کی وجہ سے چمک رہا تھا اس چمک سے اس کے اندر گرمی کی شدّت کا احساس اور بھی گہرا ہو گیا اور احساس کی یہ شدّت اس کے جسم کے اندر کسی بھاری پتّھر کی طرح دباؤ ڈال رہی تھی۔

کھدائی کا یہ کام بڑا صبر آزما تھا جس کے عوض دن ڈھلے اُسے اُجرت ملنے والی تھی مگر اس وقت اسے صرف اپنی مزدوری سے غرض تھی۔ وہ یہاں مزدوری کر رہا تھا مگر اُسے

دھیان اپنے گھر ہی کا تھا جہاں اس کے بچّے بھوک کے مارے بلک رہے ہوں گے، اس کی بیوی انھیں بہلانے کی کوشش میں کبھی سُلا رہی ہوگی تو کبھی پریشان ہو کر انھیں مار پیٹ رہی گی یہ سب کچھ سوچ کر اس کا ہاتھ جلدی جلدی چلنے لگتا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ وقت جلدی گزرے اور مزدوری ملے تو گھر پہنچے اور بیوی کو مزدوری کے رُوپے دکھائے اس خیال سے وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ وہ ان روپوں کو دیکھ کر کتنی خوش ہوگی کیونکہ انہی سے ان کے کھانے کا انتظام ہوگا، انہی سے ان سب کے پیٹ کا دوزخ بھرے گا۔

مزدوری کے بعد اسے آج اکٹھے ۳۰ رُوپے ملنے والے تھے۔ وہ دل ہی دل میں انھیں خرچ کرنے کے بارے میں سوچتا رہا لیکن اسنے اچانک یہ خیال اپنے دماغ سے کھرچ ڈالا کیونکہ وہ ابھی اس چکّر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اُسے تو فی الحال بس یہ غرض تھی کہ مزدوری اس کے ہاتھ میں آجائے یہ مزدوری اُسے کئی دنوں کے بعد میسّر آئی تھی۔ اس نے اس ٹھیکیدار کی منّت سماجت کی، اسے اپنے بچّوں کا واسطہ دیا اور جب ٹھیکیدار نے حامی بھری تو اس کے لیئے اس کا دل تشکّر آمیز جذبات سے لبریز ہو گیا۔ اگرچہ ایک دن کی مزدوری اس زمانے میں اس سے زیادہ ہوتی تھی مگر اس نے ان ۳۰ روپوں ہی کو غنیمت سمجھا اُس کے دماغ میں ایک لمحے کے لیئے یہ خیال سانپ کی طرح رینگ گیا کہ وہ کئی دنوں سے مزدوری حاصل کرنے کے لیئے خدا سے دُعائیں مانگتا رہا تھا تاکہ اپنی اور اپنے بچّوں کی زندگی کی سانسوں کو برقرار رکھ سکے مگر آج اس ٹھیکیدار کے آگے جھکنے سے وہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے قابل ہو سکا جس کو کئی دنوں سے اپنی لاش کے کندھوں پر اُٹھائے گھومتا رہا تھا۔ خیالات کی پرواز کے دوران بھی وہ مزدوری میں پوری تندہی سے مشغول رہا۔ کبھی کبھار اچٹتی سی نظر ٹھیکیدار پر ضرور ڈال لیتا تاکہ اس پر یہ ظاہر کر سکے کہ وہ کس محنت

سے کام کر رہا ہے اور ٹھیکیدار اس کے کام سے متاثر ہو کر اگلے روز بھی مزدوری پر لگالے مگر برخلاف اس کے ٹھیکیدار کسی نہ کسی مزدور کو گالیاں دے رہا ہوتا یا پھر ڈانٹ پلا رہا ہوتا۔ وہ اُدھر سے خوف زدہ ہو کر اور زیادہ انہماک سے کدال چلانے لگتا۔

ابھی اس نے سیدھے ہو کر دم لیا ہی تھا کہ چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے مزدور لپک لپک کر دوبارہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اس نے دیکھا کہ ٹھیکیدار ادھر ہی آرہا تھا، وہ بھی پوری توجہ سے پہلے ہی کی طرح اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ پھر وہ ان مزدوروں پر مُسکرایا، اس نے سوچا کہ اتنا تو یہ اُس سے بھی نہیں ڈرتے ہوں گے جس نے ان کے ساتھ پیٹ کا دوزخ لگایا ہے۔ دو ایک مزدور ابھی تلک چھپر کے نیچے ہی رہ گئے تھے کیونکہ وہ اونگھنے لگے تھے۔ ٹھیکیدار نے آتے ہی انھیں ٹھوکر سے اُٹھایا اور ماں بہن کی گالیاں دیتے ہوئے حرام خور اور نمک حرام ہونے کا احساس دلایا۔ وہ مزدور مردہ جسم کے ساتھ دوبارہ اپنے اپنے کام پر آگئے۔ وہ ٹھیکیدار کی ہر بات اور ہر گالی پر کانپ جاتا لیکن پھر بھی گھڑی گھڑی تصوّر ہی تصوّر میں اپنے آپ کو مزدوری وصول کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور آخر کار جس لمحے وہ اپنی مزدوری کے ۳۰ روپے وصول کر رہا تھا تو اس نے فخر سے ادِھر اُدھر اور مزدوروں کو دیکھا سب اپنے اپنے نوٹ گننے میں لگے ہوئے تھے۔ مزدوری وصول کرنے کے بعد سب سے پہلے وہ یہی چاہتا تھا کہ فوراً گھر پہنچے تاکہ بچّوں کو تسلّی دے۔ یہی سوچتے ہوئے دن بھر کی جان لیوا مشقّت کے باوجود گھر کی جانب تیز قدم اُٹھاتا ہُوا چل دیا۔

راستے میں تنور سے نکلتی ہوئی روٹیوں کی خوشبو اس کی ناک میں آئی تو اس نے گہرے گہرے سانس لیے وہ اس خوشبو کو اپنی رُوح تک میں اُتار لینا چاہتا تھا، اُس

نے دس کا نوٹ دے کر دو روپے کی روٹیاں خرید لیں۔ کاغذ میں لپٹی ہوئی گرم گرم روٹیوں کو ناک کے نزدیک لا کر اُس نے پھر گہرا سانس لیا اور دکاندار کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنی اس حرکت پر ندامت کا احساس ہوا۔ اُس نے بقایا رُوپے لے کر گنے تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ایک روپیہ زیادہ آ گیا تھا۔ اس نے کئی بار گنا مگر ہر بار ایک روپیہ زیادہ نکلتا جیسے جیسے وہ گنتا اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی رہیں اور سانس تیز چلنے لگی۔ اُس نے گھبرا کر دکاندار کو دیکھا جو اپنے دوسرے گاہکوں میں مصروف تھا۔ وہ اس لمحے عجیب دوراہے پر کھڑا تھا۔ اُس کا وجود دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت سلب ہو کر رہ گئی اس کے اندر سے کوئی چیز اُسے وہ روپیہ واپس کرنے کے لئے اُکساتی مگر اس کی اُنگلیاں اس روپے کو زیادہ مضبوطی سے تھام لیتیں۔ اس کیفیت میں چند لمحے یوں گزر گئے جیسے گھنٹوں بیت گئے ہوں وہ ان لمحوں کی سختی سے باہر آنا چاہتا تھا۔ اسی لئے ہمت کر کے اس نے قدم آگے بڑھائے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے قدم اس وقت وزنی ہو گئے تھے اور اس کے پورے وجود پر کسی انجانے بوجھ سے دباؤ پڑ رہا تھا وہ اس بوجھ کو اُتارنا چاہتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اپنے بچّوں کی ضروریات، بھوک اور بیوی کا کُمہلایا ہُوا چہرہ سامنے آ گیا اور وہ اپنے اندر کے وجود سے اُلجھنے لگا۔

اپنے وجود کے اسی بوجھ کو اُٹھائے ہُوئے وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی اور بچّوں نے پُر اُمید نظروں سے اُسے دیکھا اور پھر روٹیوں کی خوشبو ان کی ناک میں پہنچی تو وہ ان روٹیوں پر جھپٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جب روٹیاں ختم ہو گئیں تو اس نے اپنی بیوی کو مزدوری کا حساب کتاب بتایا۔ بیوی نے روپے گنے، ایک لمحے اسے

دیکھا اور اس فالتو روپے کے بارے میں پوچھا، اس کے لہجے میں اس روپے کی وجہ سے خوشی کا تاثر صاف ظاہر تھا۔

"یہ — یہ روپیہ؟"

"ہاں دکاندار نے بھولے سے......" وہ اٹک کر رہ گیا اُس نے دیکھا کہ اُس کی بیوی نے مزدوری کے روپے اور زیادہ مضبوطی سے مٹھی میں دبا لئے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ناکامیاں انسان کو بے حس بنا دیتی ہیں۔ اُس کی بیوی نے دکاندار کے بھولنے کو ذرا بھی اہمیت نہ دی بلکہ اس روپے کے زیادہ آجانے سے وہ اپنی خوشی کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔ اس نے بیوی کے ان احساسات کو محسوس کیا مگر وہ اپنے اندر کے وجود سے ابھی تک دست و گریباں تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن کا ایک سرا اس کے ضمیر سے ملا ہوا ہو اور دوسرا اندر کے وجود سے اور ان دونوں کے بیچوں بیچ اس کا پورا وجود ہوا میں معلق لٹکا ہوا ہو۔ کبھی اندر کا وجود اُسے اپنی طرف کھینچتا تو کبھی ضمیر۔ اس کے وجود پر بوجھ ابھی تک اُسی طرح برقرار تھا بلکہ جیسے جیسے لمحے گزرتے جا رہے تھے، یہ بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس لئے اب اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"اس روپے سے ایک وقت کی روٹیاں اور چل سکتی ہیں۔"

وہ اپنی بیوی کے یہ الفاظ کسی گہرے کھڈ میں پڑا سن رہا تھا کیونکہ وہ گہرائی میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کے وجود کے ساتھ لمحہ لمحہ کشمکش سے دوچار تھا۔ وہ اسے زیر کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور جیسے جیسے وہ اسے ختم کرنے کی کوشش کرتا اسے اپنے وجود پر وہی بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہوتا۔

"لو اس زائد روپے کا صبح کے لئے آٹا لے آؤ —"

وہ اس وقت باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ دکاندار باہر کھڑا دروازے پر ہی اس کا انتظار کر رہا ہوگا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ باہر نکلے اور دکاندار اُسے اپنی گرفت میں لے لے مگر مجبوراً اپنے وجود کے بوجھ کو اپنے قدموں پر ڈالے ہوئے وہ باہر نکلا تو باہر دکاندار نہ تھا بلکہ یہ اس کا واہمہ ہی تھا یہ دیکھ کر اُسے کچھ تسلّی سی ہوتی۔ راستے میں بھی وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر چوکنّا ہو کر چلتا رہا اسے بس یہی خدشہ تھا کہ کسی بھی لمحے کسی جانب سے وہی دکاندار آکر اس سے اَپنا روپیہ چھین لے گا۔ اُسے مجبوراً اُسی تنور کے سامنے سے گزرنا تھا کیونکہ کوئی دوسرا متبادل راستہ نہ تھا اس تنور کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم مَن مَن بھر کے ہوگئے اور اس سے ایک اینچ بھی آگے نہ بڑھایا گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے پوری کائنات کا بوجھ اس کے وجود پر لاد دیا گیا ہو۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے دکاندار کو دیکھا وہ اپنے گاہکوں میں مصروف تھا، اس کے اندر کے وجود نے اس وقت اُسے اُکسایا تو اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی قوّت ڈگمگانے لگی اور پھر اس نے خود کو بازار کی چاروں طرف پھیلی ہوئی آوازوں میں پستا ہوا محسوس کیا۔ یہ آوازیں اس کے وجود پر پھیلی رہیں۔ لیکن اس کے اندر پُراسرار خاموشی چھاگئی۔ بڑی کوشش کے بعد آخر اس کے قدم آگے بڑھے تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ گرم گرم ریت پر ننگے پاؤں چل رہا ہو۔ اُس نے دکاندار کے پاس جاکر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کہ پھر کہیں کوئی جذبہ اُسے اس بات سے باز رکھنے کی کوشش نہ کرے تیزی سے اپنی مٹھی میں بند روپے کو اس کے سامنے بڑھا دیا۔

"لو......یہ......یہ روپیہ......"

دکاندار نے لاپروائی سے وہ روپیہ اپنی صندوقچی میں ڈال لیا اور اُسے سرسری لیکن منتظر نظر

سے دیکھا مگر وہ سامنے رکھی ہوئی روپوں سے بھری ہوئی صندوقچی میں اس روپے کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔ اس عرصے میں دکاندار جھلّا کر اپنے دوسرے گاہکوں میں مصروف ہو چکا تھا۔ دکاندار کی اس روپے کی طرف سے یہ بے اعتنائی دیکھ کر اسے اپنے بیوی بچّوں کی بھوک کے مارے رُکتی ہوئی سانسوں کا خیال آگیا کہ ان کے لئے اس روپے کی کتنی اہمیت تھی۔ دکاندار کی صندوقچی میں روپوں کے ڈھیر اور بچّوں کی بھوک کے ان دو پہاڑوں کے درمیان وہ اپنے آپ کو بڑا حقیر سمجھنے لگا۔ زندگی کی حقیقتوں کے کانٹے جو اصل کانٹوں سے کہیں زیادہ نوکیلے ہوتے ہیں اب اس کی رگ رگ میں چبھنے لگے۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے اندر کے وجود سمیت ان کانٹوں پر دھڑام سے گرتے ہوئے پایا۔

"اس روپے کا کیا لوگے ؟"

دکاندار کے لہجے میں ابھی تک جھلاہٹ تھی اور اس وقت اس کے اندر کا وجود اُچھل کر اس کے حلق تک آگیا۔

"اِس ۔ یہ ۔ یہ روپیہ ؟" وہ خیالی دُنیا کے جال سے یک دم چھلانگ مار کر باہر عملی دُنیا میں آگیا۔

"یہ روپیہ واپس کر دو، مجھے کچھ نہیں لینا ــــ"

اُس روپے کا آٹا لے کر گھر واپس آتے وقت اُس کے سامنے بیوی بچّوں کے کھلکھلاتے چہرے تھے۔ اس کے ذہن پر جو بھی گرد و غبار تھا وہ اگرچہ اب اس تصوّر سے دُھل گیا تھا اور اس کے وجود کا سارا بوجھ یکلخت اُتر گیا تھا لیکن اُس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے اندر کے وجود نے کسی کونے میں دبک کر دم توڑ دیا ہو ــــ

ــــ ۸ (۱۹۷۸) ۸ ــــ

گُر کی بات

مَیں نے جب افسردہ لہجے میں اپنی بیوی کو بتایا کہ میرا تبادلہ دوسرے شہر ہوگیا ہے تو وہ کھل اُٹھی۔ میں نے پریشانی میں کہا۔

"یہ تبادلہ سزا کے طور پر ہوا ہے۔"

"اسی بہانے دوسرا شہر دیکھ لیں گے۔" اس کے لہجے میں اس شہر کو چھوڑنے کا افسوس بھی صاف ظاہر تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔

"لیکن یہ سزا کیسی؟"

اور میں جواب دینے کی بجائے اس جُرم کے بارے میں سوچنے لگا جس کی بنا پر مجھے یہ سزا دی گئی تھی۔ میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا میں نے سگریٹ سُلگایا تاکہ ذہن کی ساری گرہیں ایک جھٹکے میں کھل جائیں اور سوچ کی راہیں روشن ہو جائیں۔

میں ایک دفتر میں ایک سیکشن کا انچارج ہوں۔ میرے سیکشن کا حال وہی ہے جو عام طور سے دوسرے دفتروں میں دیکھا جاتا ہے بلکہ میں تو کہوں گا اس سے بھی قدرے خراب۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اپنے ماتحتوں کو ذمّہ داری کا احساس دلا سکوں مگر ناکام رہا۔ لمبے عرصہ کی چھٹی لینا، دیر میں آنا، پھر غائب رہنا، زیادہ وقت چائے پیتے رہنا، کام نہ کرنا اور اگر انھیں اس جانب توجہ دلائی جائے تو لڑنا جھگڑنا یا پھر لکھ کر اوپر شکایت پہنچانا ان کا وطیرہ ہی رہا۔ اس سلسلے میں کئی مرتبہ میری بیٹی ہو چکی تھی۔ سرکاری مراسلت میں اگر دیر ہوتی تو میری سرزنش ہوتی اور ہر بات کا مجرم میں ہی ثابت کیا جاتا۔ میری ملازمت پر بھی بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ میں ذاتی طور سے ہمدرد قسم کا آدمی ہوں اس وجہ سے بھی چُپ رہتا اور اس سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا۔ اس کا نتیجہ مجھے اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ آج ہی بڑے صاحب نے مجھے فون پر جھلّاتے ہوئے اپنے پاس حاضر ہونے کا حکم دیا۔ میری سمجھ میں فوری طور سے کچھ نہ آیا۔ جب میں اپنے کمرے سے نکل رہا تھا اور صاحب کے کمرے کی جانب جا رہا تھا تو کئی نظریں مجھے طنزیہ انداز میں دیکھ رہی تھیں اور ہلکی ہلکی ہنسی میرا پیچھا کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی صاحب برس پڑے۔

"میں تمہیں کب تک بچا سکتا ہوں؟"

"جی میں سمجھا نہیں" میں نے ہکلاتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"صرف ایک ٹائپسٹ رہ گیا تھا سو اب اس نے بھی تمہارے رویے کی شکایت کی ہے"۔ اب میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ صبح صبح آج جب صاحب نے آتے ہی مجھے ایک ارجنٹ کیس بھجوانے کو کہا تو میں نے فوراً ڈرافٹ تیار کر کے ٹائپسٹ کے حوالے کرنے کے لئے اسے بلایا تو پتہ چلا کہ چائے پینے گئے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد پھر بلایا تو میں نے ٹائپ

کرنے کو دیا اور بڑے صاحب کا حکم بھی سُنایا۔ جواب ملا۔

"صاحب بہت کام ہے۔ سر اُٹھانے کی فرصت نہیں۔"

"مگر یہ لیٹر بہت ضروری ہے سب کچھ چھوڑ کر پہلے یہ کرو۔"

"آپ ہر لیٹر کے بارے میں یہی کہتے ہیں۔"

اَب میں جھلاّ اُٹھا تھا۔

"دیر میں آتے ہو، آتے ہی چائے پینے چلے جاتے ہو اور اوپر سے بحث کرتے ہو۔"

وہ چلا گیا مگر کافی دیر کے بعد بھی جب ٹائپ نہیں ہُوا تو میں نے چپراسی کو بھیجا۔ چپراسی لیٹر لایا اس میں کئی غلطیاں تھیں۔ میں نے دُرست کر کے پھر بھیجا۔ اس عرصے میں بڑے صاحب نے بھی اس لیٹر کے بارے میں دو مرتبہ پوچھا لیکن میں نے انھیں مُناسب جواب دے کر اطمینان دلا دیا اور اس ٹائپسٹ پر کوئی بات آنے نہیں دی۔ میرا جی چاہا کہ صاحب کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کر دوں مگر سچ کی آگ انسان کو جُھلسا دیتی ہے۔ مجھے ٹائپسٹ کا مُرجھایا ہُوا چہرہ اس کی صحت اور اس کے بچّوں کا خیال آگیا۔

"تمہیں اس سے کوئی ذاتی رنجش ہے۔"

"جی نہیں۔ میں اپنے ماتحتوں کو برابر سمجھتا ہوں۔"

مگر صاحب گرجتے رہے۔ میں چُپ رہا کیوں کہ انسان سچ بولے تو زندگی طوق بن جاتی ہے۔

"میں ابھی تمہارا تبادلہ کرتا ہوں تمہیں ایک ہفتے کے اندر اندر وہاں چارج سنبھالنا ہوگا۔ وہاں سے بھی ایسی ہی رپورٹس ملیں تو تمہاری ترقّی بھی روک دی جائے گی۔"

مَیں سر جُھکا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے مجھے ریت کے گرم

مجرا میں دھکیلا جا رہا ہو کمرے میں پہنچا تو چپراسی بھی پیچھے پیچھے بھاگا آیا۔

"صاحب کیا ہُوا؟"

"کچھ نہیں۔ تم جاؤ۔"

"بڑے صاحب نے کیا کہا؟" اسکی آواز میں اشتیاق تھا۔

"میرا تبادلہ ہو گیا ہے" میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات تلاش کرنے لگا مگر وہ بولا۔

"صاحب ہم کو پہلے ہی معلوم تھا!"

"کیسے!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ہیں نا احمد صاحب۔ بہت دنوں سے اس سیکشن میں آنے کے لئے سفارش لگوا رہے تھے۔" میں اس کی ان معلومات پر چونکا۔ مجھے یہ سب معلوم نہ تھا اور اس کو پہلے سے معلوم تھا۔ وہ اپنی صحیح اطلاع پر خوش ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا میں جا رہا ہوں تو کوئی بھی آئے۔ ویسے احمد میرا اچھا دوست تھا۔ وہ بے چارا اس دفتر کے حالات سے کس طرح نمٹے گا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ جس جگہ بھیجا جا رہا ہوں وہ پہلے ہی کارکردگی کے سلسلے میں بدنام ہے۔ یہ ساری پریشانیاں لے کر میں جب گھر پہنچا اور بیوی کو بتایا تو وہ کھل اٹھی اس کے خوش ہونے سے میرا بوجھ کچھ کم ہُوا۔

یہ سب کچھ چھوڑ کر میں دوسرے شہر جا پہنچا۔ شہر انجانا، لوگ اجنبی دوسری صبح مجھے دفتر کا چارج لینا تھا۔

جب میں دفتر پہنچا تو سب سے پہلے ایک منحنی سے شخص نے میرا استقبال کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ وہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ پھر اس نے ہی دفتر

میں موجود چند لوگوں سے ملوایا۔

"یہ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ یہ دفتری۔ یہ یوڈی سی۔"

میں نے خوش اخلاقی سے سب سے ہاتھ ملایا۔

"یہ چند لوگ ہی ہیں؟"

"نہیں صاحب۔ بہت ہیں۔ یہاں آپ کے کم از کم چالیس ماتحت ہوں گے۔"

وہ اپنے خیال میں میری شان بڑھا رہا تھا۔

"اور لوگ کہاں ہیں؟"

"سب اطمینان سے آئیں گے۔"

یہ سُن کر کچھ دیر تو مجھے اپنے وجود کا احساس ہی نہیں رہا اور پھر پہلے والے دفتر کا خیال آ گیا۔ اس دفتر کے بارے میں مجھے پہلے ہی معلوم تھا اس لئے چُپ رہا۔ میں نے اس وقت موجود لوگوں کی صحیح وقت پر آنے کی تعریف کی تو سپرنٹنڈنٹ نے چُپکے سے کہا۔

"صاحب یہ لوگ بھی اس لئے موجود ہیں کہ یہ دفتر ہی میں رہتے ہیں۔" میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بتایا گیا۔

"بس جی یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا۔ یہ دفتر ہے۔"

حلق میں پھنسے ہوئے یہ الفاظ میری زبان سے نکل پڑے تو وہ لوگ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے اور میں نے خود کو اس بھنبھناہٹ کے ڈھیر میں دبا ہوا محسوس کیا۔ یہ ڈھیر لمحہ لمحہ شکر نے لگا جیسے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر اس میں مل جائے گا۔ میں نے آوازوں کے اس ڈھیر سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کے چہروں کو دیکھا۔ اب ان سب کے

چہروں پر خوشامد کے تاثرات کی جگہ نفرت نے لی تھی ۔ میں نے اس نفرت کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا :

" باقی لوگوں کو اطلاع نہیں تھی کہ میں آج چارج لے رہا ہوں ۔"

" سب کو تھی ۔"

" تو پھر سب کو جلدی آنا چاہیے تھا ۔"

" صاحب یہ لوگ یہاں کے مستقل کام کرنے والے ہیں ، افسران تو کئی آئے اور چلے گئے ۔"

میرے اندر سے کوئی چیز ٹوٹ کر باہر آگری ۔ پھر سپرنٹنڈنٹ مجھے مختلف کمرے دکھانے لگا ۔ دیواروں پر جالے اور دھبے ، فرش پر کوڑا کرکٹ ، کاغذ کے ٹکڑے ، میزوں پر فائلوں اور کاغذات کا انبار ، دھول میں اٹی فائلیں ۔ سب سے پہلے اسی روز میں نے دو احکامات جاری کئے ایک تو دفتر کی فوری صفائی اور دوسرا دفتر کے کمرے خالی کرنے کے بارے میں ۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں ایک مرتبہ پھر کمرے سے باہر نکلا ۔ اس وقت دس بجے ہوں گے ۔ میں نے دیکھا اب ساری سیٹیں بھر چکی تھیں ۔ کسی نے کھڑے ہو کر کسی نے بیٹھے بیٹھے سلام کر کے اور کسی نے صرف ایک نظر ڈال کر میرا استقبال کیا ۔ میں نے سب کو بغور دیکھا ۔ ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں شاید کم آمدنی اور زیادہ خرچ کی وجہ سے تفکرات میں گھرے ہوتے تھے ۔ بال بکھرے ہوئے ، کپڑے بھی زیادہ صاف اور نہ قاعدے کے یہ سب کچھ دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرا وجود ہر طرف بکھرنے لگا ہے ۔

تین چار روز ہی میں دفتر کے کمرے خالی کر دیئے گئے اور صفائی بھی ہو گئی مگر روزانہ جب میں آتا جاتا تو فائلوں اور میزوں پر گرد جمی ہوئی ضرور نظر آتی ۔ میں جب کسی

کام سے باہر نکلتا تو کئی لوگوں کو کرسیوں پر اونگھتے ہوئے پاتا۔ کئی کو میزوں پر پاؤں رکھے دیکھتا۔ کچھ اپنی کتابیں اور رسالے بیٹھے پڑھتے رہتے۔ کئی دفعہ کی ڈانٹ کے بعد محض یہ فرق پڑا کہ جب میں گزرتا تو سب ہوشیار ہو جاتے۔

"آخر یہ سب کیا ہے" میں نے ایک روز سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر کہا۔

"اجی گستاخی معاف یہ تو چلتا ہے۔"

میرا دل چاہا کہ اس کا گریبان پکڑ لوں مگر میرے پاؤں میرے اپنے وجود کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور خاموشی میری زبان پر پنجے گاڑے دبکی پڑی تھی۔ اتنے دنوں میں، میں نے محسوس کیا کہ یہاں کے لوگ کام میں کچھ زیادہ ہی سست ہیں اور کرتے بھی ہیں تو کئی بار بتانے پر صحیح کرتے ہیں۔ اس لئے میرا کام اور میری ذمّہ داری کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی میں نے جب ٹوکنا شروع کیا تو کئی لوگ چھٹی لے کر بیٹھ گئے۔ دفتری کام میں اور حرج ہونے لگا۔ لوگ ہمیشہ دیر میں آتے تو ایک آدھ سے لکھ کر پوچھا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

میں اس عرصے میں احمد سے فون پر کئی بار بات کر چکا تھا۔ اس شہر اس کے لوگوں اور دوستوں کے بارے میں پوچھتا پھر بات مختلف موضوعات سے ہوتی ہوتی دفتر پر آ کر رکتی تو احمد لاپروائی سے کہتا:

"سب ٹھیک چل رہا ہے۔"

میں تعجب کا اظہار کرتا تو کہتا:

"یہ سختی سے باز آتے ہیں۔"

میں کہتا کہ میں نے سختی بھی کی تو میری رپورٹ اوپر کر دیا کرتے تھے اور اس کا نتیجہ

میں بھگت رہا ہوں، تو کہتا:

" بہت سوں کی میں نے رپورٹ خراب کر دی اور کئی کی روز دیر میں آنے پر غیر حاضری لگا دی۔ کئی کی زیادہ چھٹی کرنے پر تنخواہ کاٹ لی۔ کاہلی اور سستی پر آئے دن بڑے صاحب سے پہلے ہی شکایت کر دیتا ہوں۔"

میں سنتا رہا۔ مجھے ان لوگوں پر رحم بھی آتا۔ مگر یہ جذبہ یکایک ختم ہو جاتا جب میں یہ سوچتا کہ انہی کی رپورٹ پر میں یہاں بھیجا گیا ہوں۔ پھر سوچتا شاید احمد ٹھیک ہی کر رہا ہے۔ کبھی کبھار میں اپنے دفتر میں بھی یہی کچھ کرنے کی سوچتا۔ سپرنٹنڈنٹ بھی مجھے سختی پر اکساتا۔ ہیڈ کوارٹر سے مراسلت میں دیر ہوتی، متعلقہ آدمی کو بلا کر بات کرتا تو خوشامد میں بچھ جاتا مگر بعد میں رویّہ وہی رہتا۔ ہر شخص پر کلف چڑھا ہوا تھا۔ کلرکل ذہنیت یہاں بھی ویسی ہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لوگ پیدا ہی کلرک ہوئے تھے۔ قسمت سے کلرک ہونا کوئی ایسی بُری بات نہیں۔ شاید یہ ذہنیت پوری قوم میں رچ بس گئی تھی۔ کئی مرتبہ ہیڈ کوارٹر سے اس دفتر کی غیر مطمئن کارکردگی پر سختی سے نوٹس بھی لیا گیا۔ بڑے صاحب فون پر بات چیت کرتے ہوئے یہی کہتے:

" میں نے تمہیں وہاں اس لئے بھیجا تھا کہ تم پچھلے واقعات سے سبق لے کر کارکردگی بہتر کرو گے۔"

میں کہتا " صاحب بہت سے کام میں خود کرتا ہوں، لوگوں سے خوش اسلوبی سے پیش آتا ہوں مگر....."

" مگر....." وہ چلاتے " اس کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ ابھی تمہارے خلاف ایک شکایت آئی ہے اس پر کئی لوگوں کے دستخط ہیں۔"

میں حیران رہ گیا اور میرے پورے جسم میں کیڑے سے رینگنے لگے۔ صاحب کہہ رہے تھے:

"اس سے قبل وہاں کے یونٹ سے ایسی شکایت کبھی نہیں ملی۔"

اس وقت اور ایسے ہی دوسرے لمحات میں، میں اپنے ضمیر کی آواز سنتا ہوں اور اپنے آپ کو دنیا کا معصوم اور مظلوم انسان سمجھتا ہوں۔

"میری بدقسمتی ہے۔" میرا لہجہ سپاٹ تھا اور جسم بالکل ساکت۔ میرے وجود میں صرف میری آنکھیں ہی متحرک تھیں۔

"اس طرح تمہاری ترقی بھی مشکوک ہو جائے گی" انھوں نے ہمدردی میں بتایا۔ میرے وجود میں سے ایک وجود اچھل کر باہر نکل آیا اور اس کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا، وہ انجان بن گیا۔ میں نے سب کو بلا کر ایک ایک سے پوچھا سب نے قسم کھالی۔ میں برس پڑا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میرے برسنے سے خاموشی چھا گئی۔ اتنی گھنی خاموشی کہ مجھے اپنے سانسوں کی آواز صاف سنائی دینے لگی اور میں اچانک خاموشی سے میں تنہا ہو گیا۔ یہ خاموشی مجھے ڈسنے لگی۔ میں نے سوچا زیادہ دیر خاموش رہا تو آوازوں کے بھنور پھیلنے لگیں گے۔ میں اٹھ کر گھر کی طرف چلا آیا۔

دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ بڑے صاحب کے الفاظ بار بار ذہن میں آتے اور ہتھوڑے بن کر برسنے لگتے۔ نڈھال گھر پہنچا تو بیوی لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھی۔ میں جا کر برابر والی کرسی میں دھنس گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا پورا وجود دلدل میں دھنستا جارہا ہو۔ وہ بے حد خوش تھی، اس کی خوشی سے بھرپور زندگی سے میرے اندر ایک امنگ نے سر ابھارا مگر بڑے صاحب کے الفاظ اس وقت بھی پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے اور یہ الفاظ میرے دماغ کی رگوں میں بہنے والے خون کے ساتھ مسلسل گردش کر رہے تھے۔ میں یہ بات بھی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ بیوی

کی تفریح میں خوش دلی سے ساتھ نہیں دے پا رہا ہوں کیونکہ ایک بے معنی سی پریشانی کچھ اس طرح ذہن میں چپک کر رہ گئی تھی کہ زندگی کا سارا حسن کہلا کر رہ گیا تھا۔ اس نے نوکر سے چائے لانے کو کہا، میں نے کرسی کے پیچھے سر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"جب سے تم یہاں آئے ہو، زیادہ ہی پریشان رہتے ہو۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"اب مجھے فکر ہوتی جا رہی ہے۔" چائے بنا کر مجھے دیتے ہوئے کہنے لگی۔

اُسے میرے دفتری حالات سے آگاہی تھی مگر ہمیشہ ہنسی میں اُڑانے کی کوشش کرتی۔

"تم تو پاگل ہو، چلنے دو جیسا چل رہا ہے۔"

"نہیں۔ معاملہ زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔"

"چھوڑو ان کے حال پر۔ اور افسر بھی تو ہیں تم بھی ویسے ہی بن جاؤ۔"

"میں نے سوچ لیا ہے، سدھارنا ہے ان سب کو۔"

"تم اپنی سی تو کر چکے اب کیا رہ گیا ہے۔"

"اس وقت اس لئے پریشان ہوں کہ میری ترقی رُک جانے کا اندیشہ ہے۔"

اب وہ واقعی پریشان ہو گئی، کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس طرح مسکرائی جیسے سارا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔ میں نے اسے تجسس کی نظروں سے دیکھا وہ بے حد مطمئن نظر آنے لگی تھی۔

"بس سمجھ لو تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔"

اسی اثناء میں نوکر برتن اٹھانے آ گیا تھا۔ اس لئے اس نے سرگوشیوں میں مجھے ایک بات بتائی تو میں اُچھل پڑا اور ساری ذہنی اُلجھن اور تھکن جیسے یک لخت ختم ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری زندگی میں پھیلے ہوئے اندھیرے چھٹتے جا رہے ہوں اور کرنیں پھوٹ رہی ہوں

واقعی عورت مرد کی نفسیات کو خوب سمجھتی ہے۔ میں اسے آسودہ نظروں سے دیکھتا رہا وہ مجھے کھینچتی ہوئی سامنے اودے اودے پہاڑوں کی جانب لے جانے لگی۔ اس وقت مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے ایک تھکا ماندہ انسان خود میں زندگی کا احساس پالے۔

اگلے روز صبح جب میں دفتر پہنچا تو میں نے کسی پر دھیان نہ دیا سیدھا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ حسب عادت میرے پیچھے داخل ہوا اور ساری رپورٹ دی کہ فلاں نے آپ کو یہ کہا، فلاں صحیح کام نہیں کرتا، فلاں آج پھر دیر میں آیا مگر میں نے اس کی کسی بات پر دھیان نہ دیا بلکہ عام طریقے سے اور لاپروائی سے باتوں ہی باتوں میں بتایا۔

"کام زیادہ ہوتا ہے اور ٹائپسٹ ایک ہی ہے اس لئے میں ایک لیڈی ٹائپسٹ رکھ رہا ہوں۔"

اس کی ناک پر گری ہوئی عینک سنبھل کر آنکھوں پر آ گئی اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے پورے جسم میں خوشی کی لہریں دوڑنے لگی ہوں۔ میں نے یہ سب کچھ محسوس کیا مگر صرف لطف لیتا رہا وہ فوراً ہی چلا گیا اور ذرا سی دیر میں یہ بات سارے دفتر میں پھیل گئی اس دوران سپرنٹنڈنٹ میرے پاس کئی مرتبہ آیا وہ تفصیل پوچھنا چاہتا تھا میں جان بوجھ کر ٹالتا رہا۔ دفتر میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ دفتر سے جاتے وقت میں نے سپرنٹنڈنٹ کو وہ دن بھی بتا دیا جب لیڈی ٹائپسٹ یہاں جوائن کرے گی یہ بتا کر میں مطمئن ہو گیا کہ اب سارے دفتر میں یہ خبر خود بخود پھیل جائے گی۔

جس روز لیڈی ٹائپسٹ کو جوائن کرنا تھا اس روز میں معمول سے کچھ پہلے ہی دفتر جا پہنچا میں نے دیکھا ہر شخص اپنی سیٹ پر موجود ہے، لباس صاف ستھرا، شیو بنا ہوا سب کی میزیں اور کرسیاں صاف ستھری، فائلوں کی گرد صاف سب ہوشیار ہو کر بیٹھے تھے۔ ان کی وہ اونگھ اور سست روی ختم ہو چکی تھی۔ سب نے میرے آنے کا نوٹس بھی لیا اور سب کے ہاتھ سلام کے لئے

اُٹھے۔ میں اپنی کامیابی پر حد ہوش اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ حسبِ عادت سپرنٹنڈنٹ بھی میرے پیچھے داخل ہوا۔ میں نے دیکھا اس کی عینک اپنی صحیح جگہ پر تھی۔ شیروانی صاف ستھری۔ سفید بالوں میں خضاب واقعی وہ اپنی عمر سے کم لگ رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ چونکا اور کھسیا کر ایک فائل سامنے رکھ دی۔

ہر شخص کی آنکھوں کے راستے دلوں پر قدم رکھتی ہوئی لیڈی ٹائپسٹ تقریباً بارہ بجے کمرے میں داخل ہوئی۔ سپرنٹنڈنٹ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے لڑکی کے سراپے کا جائزہ لیا۔ بے حد ماڈرن معلوم ہوتی تھی۔ بھرا بھرا بدن، چہرے پر مقناطیسیت اور لباس پہننے کے باوجود نیم عریاں۔ میں نے اُسے بڑے ہال میں ایک نمایاں جگہ دی۔ میں تصور میں اپنی کامیابی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس سے قبل میرے تصورات کو تلخ حقیقت کا جھکڑ مسمار کر دیا کرتا تھا اور میں عجیب سی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا اور وقت کی نبضیں تھمتی ہوئی محسوس ہوتیں لیکن اب میرے تصورات حقیقت کا روپ دھارنے لگے تھے۔ ہر شخص وقت پر آنے لگا، ہر شخص میں خوش اخلاقی جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ اب اپنی اپنی سیٹ پر ہوشیار ہو کر بیٹھتے۔ اپنے لباس کا خیال رکھتے۔ نہ کوئی چھٹی لیتا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ روز کا کام روز ہی نمٹایا جانے لگا کیونکہ سب اپنے آپ کو چست اور ہوشیار ظاہر کرنا چاہتے تھے تاکہ لڑکی کے سامنے ڈانٹ نہ کھانی پڑے۔

احمد نے بھی میری اور میرے دفتر کی کارکردگی کی تعریف کی اس نے بتایا اس کے دفتر میں اس کے خلاف اس کی سختیوں کی وجہ سے اب بغاوت کی بو آنے لگی ہے اور ماتحت ہڑتال کرنے والے ہیں۔ وہ بے حد پریشان بھی تھا۔ اب بہتر کارکردگی کی وجہ سے میں اکثر اپنے ماتحتوں کو تعریفی کلمات سے نوازتا اس سے قبل ہیڈ کوارٹر میں یہ دفتر بڑا بدنام تھا اب وہاں سے بھی شکایات ختم ہو گئیں۔ اب میری شکایت بڑے صاحب تک جانا بھی بند ہو گئی تھی۔ ایک روز انھوں نے فون پر میری کارکردگی اور میرے ایڈمنسٹریشن

کی بڑی تعریف کی۔ بڑے صاحب نے اس اچانک تبدیلی کی وجہ بھی پوچھنی چاہی مگر میں ان سے کیا کہتا۔ وہ میری بات پر اب جھلا نہیں رہے تھے قہقہے لگا رہے تھے اور پھر انھوں نے خود ہی مجھے بتایا کہ تمہاری ترقی ہو گئی ہے!!!

تیز ہوا کے سامنے

جس تیزی سے وہ باہر سے آئی تھی، گھر میں داخل ہوتے ہی جاتی رہی بلکہ اسے
یوں محسوس ہوا جیسے وہ تنہائیوں کی اتھاہ کھائیوں میں اُتر گئی ہو۔ ان دنوں اس سے کہیں
زیادہ گہری تنہائی اس کے وجود میں سمٹ آئی تھی اور ذہن میں لمحے لمحے سناٹے کی
سیٹیاں بجتی رہتیں۔

اس نے حسبِ معمول کمروں میں جھانک کر دیکھا، سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔
کسی کونے سے بیزاری اس کی طرف لپکتی اور کسی کونے سے اُداسی، گھر میں ہر طرف سے
کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوتے۔ کالج میں لیکچر دینے سے زیادہ اب اس کا ذہن گھر آ کر تھکنے لگا۔
یہ تھکن اس کے جسم ہی کی نہیں تھی، اعصاب کی بھی تھی، ذہن کی تھی، رُوح کی تھی۔ اور کپڑے
تبدیل کئے بغیر مسہری پر جا پڑتی۔ پہلے وہ گھر سے جلدی جلدی کالج جاتی اور لیکچر ختم کر کے

فوراً اس سے زیادہ تیزی سے گھر کی جانب روانہ ہوجاتی تھی جیسے وہاں اُس کا کوئی منتظر ہو اور جاتے ہی گھر کے کام کاج میں یوں لگ جاتی جیسے کوئی آنے والا ہو۔ مگر اب اس کی ساری تیزی ختم ہوگئی تھی۔ گھر سے نکلتی تو اپنے سے بھی بیزار ہوتی، واپس لوٹتی تو اداس۔ اس پر اب ہر لمحے ایک انجانے انتظار کی سی کیفیت چھائی رہتی۔ ہر کھٹکے پر بھاگ کر دروازے پر جاتی۔ ہر گھنٹی پر عدم اعتماد کے ساتھ دوڑتی مگر تھکے قدموں سے واپس ہوتی۔ کالج میں اس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتیں۔ راستے میں اُسے یہی احساس رہتا کہ ابھی کوئی اُسے اس کا نام لے کر مخاطب کرے گا اور وہ اپنی نظریں اُٹھائے گی تو انور کا چہرہ اس کے سامنے ہوگا اور اس کے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ ہوگی جیسی اُسے مناتے وقت اس کے چہرے پر آجاتی تھی۔

ان دنوں اسے سارے کام خود ہی کرنے پڑتے بازار کے، گھر کے اور بچوں کے۔ ہر کام کرتے ہوئے اس کا دھیان غیر شعوری طور سے انور کی طرف ضرور چلا جاتا کہ وہ ہوتا تو یہ سارے تھکا دینے والے کام اسے تنہا کیوں کرنے پڑتے مگر وہ اس کا احساس ہی کب کرتی تھی۔ یہ سوچ کر وہ خود کو بُرا بھلا بھی کہتی اور اس کا ذہن پچھتاوے میں ڈوب جاتا، اب گھر کی صفائی اور سامان قرینے سے رکھنے میں اس کا دل قطعی نہ لگتا۔ ڈرائنگ روم کے فرنیچر اور کتابوں کی الماری پر اب گرد کی تہہ جم گئی تھی۔ اُس نے یہ دیکھا تو بلا سوچے اُٹھ کر میلے کپڑے سے گرد جھاڑنے لگی مگر گرد جھاڑتے ہوئے وہ اور بیزار ہوگئی کہ اب یہاں کون آکر بیٹھے گا پہلے تو انور کے دوست آتے تھے۔ انور وہاں بیٹھ کر لکھا پڑھتا رہتا تھا اس خیال سے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں لیکن دُوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو خشک

کرنے کے بعد صفائی کا کام ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

اُسے اب رفتہ رفتہ یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کچھ کھو بیٹھی ہے اور دھیرے دھیرے اس احساس کی ہلکی ہلکی کسک اس کی روح کے کڑوے دھوئیں کی طرح اُس کے وجود میں پھیل رہی تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کی خاطر وہ اپنی زندگی کے پس منظر پہ دُور دُور نظر دوڑاتی مگر اسے ایسی کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آتی جس کی بنا پر وہ انور سے ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی تھی، ایسے موقعوں پر انور ہمیشہ چپکے سے باہر چلا جاتا وہ بظاہر اُس کی کبھی پرواہ تک نہ کرتی تھی اس کے باوجود اس کیفیت میں اس کے سر میں درد ضرور ہونے لگتا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ رہتی لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد چہرے پر مسکراہٹ کے پھول سجائے وہ واپس آجاتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایسے موقعوں پر وہ اندر ہی اندر خوش ہوتی جیسے اس کے کسی جذبے کو تسکین ملی ہو۔ اور پھر یہی رویّہ اس پر غالب آتا چلا گیا کیونکہ وہ اپنی شخصیت کو ہر اعتبار سے مکمل سمجھتی تھی اور اُسے یقین سا تھا کہ اس کی زندگی کی راہ میں کبھی بے بسی کا اندھیرا نہیں چھا سکتا اور نہ اس کے قدموں تلے کبھی زلزلے کی کیفیت آئے گی۔

مگر ایک روز اُس نے نجانے انور سے اپنی عادت سے مجبور ہو کر کیا کہہ دیا کہ وہ اُسی وقت گھر سے چلا گیا۔ اگرچہ اس نے حسبِ معمول اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن رات گئے تک وہ واپس نہ آیا تو اسے انتظار شروع ہو گیا۔ اس رات کا ایک ایک پل اس کی آنکھوں میں سے گزر کر اس کی رُوح میں ہلچل مچاتے جا رہا تھا۔ خوف اور بُرے بُرے خیالات اُس پر بُری طرح چھائے ہوئے تھے کیونکہ اس سے پہلے وہ کبھی تنہا نہیں رہی تھی۔ اس وجہ سے اس وقت اسے انور کی اہمیت کا شدت سے احساس ہوا نہ کبھی گھڑی گھڑی اُٹھ کر

چاروں طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ نظروں سے اس کی گود میں سمٹے چلے جا رہے تھے۔ اُس نے اُٹھ کر ساری کھڑکیاں بند کر دیں اور پردے ڈال دیئے مگر اس کے باوجود باہر کا خوف دراڑوں سے ہو کر اس کے وجود کی طرف مسلسل رینگ رہا تھا اور اس کے مساموں میں سے رِس رِس کر اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ باہر سے آتی ہوئی کتّے کے بھونکنے یا چوکیدار کی آواز سے وہ دہل کر رہ جاتی اور بچے گھگھی باندھے اس کے وجود میں دوبارہ گھُسنے کی کوشش کرنے لگتے۔ وہ انہیں جھوٹی تسلّی دیتی تو بچّے کہتے۔

"آپ بھی تو ڈر رہی ہیں؟"

صبح اس نے انور کے آفس میں فون کرنے کی سوچی مگر اس کے اندر کا کوئی جذبہ آڑے آ گیا وہ کسی صورت انور کے سامنے جھکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے کسی رشتہ دار یا دوست سے بھی نہیں دریافت کیا کیونکہ اس میں اسے اپنی کمزوری اور ہیٹی محسوس ہوتی تھی، بچّوں نے اس سے باپ کے بارے میں دریافت کیا تو انہیں کسی طرح سمجھا بجھا کر اور ڈانٹ ڈپٹ کر چُپ کرا دیا مگر خود اس کے ذہن میں کسی انجانی پریشانی نے جگہ لے لی تھی۔

کوئی گھر میں آتا تو اس سے یہی کہتی کہ ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ اس کے بعد مجبوراً یہ کہنا شروع کیا کہ سرکاری دورے پر گئے ہیں نجانے کب آئیں گے کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بات کھُلے اور اس کے اس اندرونی جذبے کے آبگینے کو ٹھیس پہنچے مگر ایسے لمحوں میں وہ ہمیشہ متغیر ہو جاتی اور یہ کیفیت بتدریج بڑھتی جاتی۔ بچّے اس واقعے کے بعد سے ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے رہنے لگے، ان میں جو بے فکری کی ہنسی اور جولانی تھی وہ جاتی رہی۔ ہنستے تو یوں لگتا جیسے اُسے چڑانے کے لئے زبردستی ہنس رہے ہوں اب وہ گھر سے

باہر بالکل نہ نکلتے ان کی شرارتیں رہی تھیں نہ دھما چوکڑی ان کو چُپ لگ گئی تھی اور گھبرائے گھبرائے سے رہتے جیسے ان کا اعتماد اور بھروسہ یکایک جاتا رہا ہو اور ان کی شخصیت میں زبردست جنگ دو بدو ہو رہی ہو۔ وہ خود اس کی وجہ ان سے پوچھتے ہوئے گھبراتی انھیں مطمئن کرنے اور ان کی توجہ ہٹانے کو باتیں کرتی تو وہ کرید کرید کر یہی پوچھتے۔

"آخر ابو کب آئیں گے؟"

لیکن اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا بس وہ اپنے اندر کسی جذبے کو دبانے کی کوشش کرنے لگتی اس کوشش میں اُسے لگتا جیسے خود اپنے آپ کو سزا دے رہی ہو۔ اب اس عرصے میں وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ ماں، بچوں کو صرف ممتا دے سکتی ہے۔ اعتماد، بھروسہ، جراُت اور بے باکی نہیں۔ ان دنوں بچوں کی خواہ مخواہ کی ضدیں بھی بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ دو تین بار اس نے تنگ آ کر انور کے دفتر کا نمبر بھی ملایا مگر اسے کوئی اندرونی طاقت انور کے بارے میں پوچھنے سے روک دیتی اور وہاں سے آواز آنے سے پہلے ہی ریسیور واپس رکھ دیتی۔ وہ اپنی اس اندرونی رکاوٹ سے لڑنے جھگڑنے بھی لگی مگر ہمیشہ اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیتی۔ اس کا دماغ اُکھڑا اُکھڑا اور دل اُجڑا اُجڑا سا رہنے لگا۔

محض بچوں کی ضد کی وجہ سے ایک شام وہ ٹہلنے کی غرض سے بچوں کو لئے باہر نکلی اور راستے میں اُسے ایک شخص ٹائی لگائے نظر آیا تو اُسے دیکھتے ہی سب سے پہلے اسے جو خیال آیا وہ یہی تھا کہ انور کو کبھی ٹائی باندھنا نہیں آئی۔ یہ سوچ کر وہ مُسکرائی بھی لیکن اب وہ ہنستی تو اس کی آنکھوں کا اضطراب سارا بھانڈا پھوڑ دیتا بے یقینی اور عدم اعتماد کے جھونکوں کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر مرجھا رہی تھی۔ اس مُسکراہٹ کی اپنائیت کی وجہ سے اس نے لمحے بھر کے لئے انور کو اپنے پاس محسوس کیا اور اسی لئے وہ فوراً ہی گھر کی جانب لوٹ آئی۔ راستے میں بھی اس کا

ذہن انور کی طرف رہا۔ آتے ہی کسی انجانے جذبے کی وجہ سے الماری سے نکال کر انور کے کپڑے دیکھنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے انور ان کپڑوں کے اندر موجود ہو مگر بچوں نے اس کے خیالات کے تانے بانے توڑ دیے اور کپڑے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ابو آ رہے ہیں ؟"

وہ کچھ نہ کہہ پائی بس کلیجے پر جیسے آری سی چل گئی۔ وہاں سے بچوں کے جانے کے بعد انور کے کپڑوں میں اپنا چہرہ دے کر رونے لگی اور اسے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے آنسو اس بے بسی سے بے اختیار نکل آئے تھے۔

اس کی شخصیت میں پہلے جماؤ تھا لیکن اب اندر ہی اندر بکھری بکھری سی رہنے لگی تھی وہ اپنے کو ہر لحاظ سے ادھوری پاتی جیسے زندگی کا کوئی مقصد نہ رہا ہو۔ اسی کیفیت میں کالج سے ذہنی اور جسمانی دونوں طور سے بے حد نڈھال نکلی تو اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ جاتے ہی مسہری پر جا پڑے مگر اسے ابھی بچوں کو اسکول سے لینا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اندر ہی اندر بے حد اکتائی اور الجھنیں اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھونے لگیں اس موقعے پر اسے انور شدت سے یاد آیا۔ اس کی موجودگی میں اسے کتنا آرام ملتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سوچنے لگی کہ اس وقت انور جانے کہاں ہوگا اسے بھی اس کا اور بچوں کا خیال آتا ہے یا نہیں آخر اس نے اپنا دل اتنا سخت کیوں کر لیا اس لمحے اسے محسوس ہوا جیسے اس کا دل ڈوب رہا ہو اور ساری کمزوری اس کے قدموں میں آ گئی ہو۔ ایسے ہی خیالات کو لئے بچوں کے اسکول پہنچی تو انہوں نے دیکھتے ہی خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔

"آج ابو ہم سے ملنے آئے تھے۔"

وہ بے اختیار بولی "تو پھر کیا ہوا؟"

"انھوں نے ہمیں کلاس سے بلوا کر خوب پیار کیا"

اس سلسلے میں وہ بہت کچھ سُننا چاہتی تھی۔

"ہم نے ابو سے ہمیں لے جانے کی ضد کی تو بولے کہ تمہاری امی اداس ہو جائیں گی"

یہ سُن کر وہ اندرونی کیفیت کو دباتے ہوئے محض خاموش ہی رہی۔

"ہم نے ابّو سے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ چُپ ہو گئے"

یہ کہہ کر چھوٹے بچّے نے اس کے چہرے پر اپنے ننھے ہاتھ سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"امّی آپ ابّو سے ناراض کیوں رہتی ہیں"

وہ کوئی جواب نہ دے پائی اور بچّے کا وہی ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پر خود ہی مسلسل مارنے لگی اسے لگا جیسے دل پگھل کر پانی کی صورت میں اس کی آنکھوں میں آگیا ہو اور ذہن جگہ جگہ سے چٹخ گیا ہو۔

پھر بچّوں کو گھر چھوڑ کر بازار سے سودا سلف لینے نکلی۔ اب راستہ چلتے ہوئے اسے ہر لمحے عجیب عدم اعتمادی کا خدشہ رہتا۔ اس کے پاؤں کے نیچے جگہ جگہ گڑھے آجاتے۔ نا جانے کون سے قدم پر کس گڑھے میں جا پڑے۔ اسی وجہ سے مستقل خوف اور ساتھ چلنے والے لوگوں کی چبھتی ہوئی نظروں سے گھبرا کر وہ تیز چلنے لگتی۔ اس وقت بھی اس پر یہی کیفیت چھائی ہوئی تھی کہ اچانک پیچھے سے کوئی آکر اس کے آگے نکل گیا۔ اس نے دیکھا وہ انور تھا۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اُسے آواز دے مگر اندر سے کسی طاقت نے اس کی اس آواز کو اب پھر باہر نہ نکلنے دیا اسے لگا کہ اس کشمکش سے اس لمحے اس کا جسم پھٹ جائے گا۔ انور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چیخ

چیخ کر اُسے آواز دینا چاہتی تھی مگر اندرونی رکاوٹ اس کے مقابلے میں تنی کھڑی تھی جس سے مجبور ہو کر وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور زندگی کی راہ کی ڈھلان کی پھسلن پر کھڑی اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگی۔ اس کی انا اب زخمی ہونے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے مگر بازار کے مجمع سے گھبرا کر اس نے برداشت کیا اور اس ردِ عمل سے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا مزید گہرا ہو گیا۔ اُس کے قدموں میں جان نہ رہی اور ہاتھ میں سامان سے بھری ٹوکری اُس سے اُٹھائی نہ گئی۔ اس نے وہ زمین پر رکھ دی اور مجبوراً وہیں بیٹھ گئی کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ اب وہ سنبھل نہ پائے گی اور اگلے ہی لمحے گرنے والی ہے۔ اسی حالت میں اس نے محسوس کیا کہ کسی نے اُسے اُس کے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا۔

واپسی میں سامان کی ٹوکری انور کے ہاتھ میں تھی اور اس کی انا کا بھاری بھرکم دیو نڈھال ہو کر کسی گہرے اندھیرے کھڈ میں گر چکا تھا۔ ذہنی کھنچاؤ اور اندرونی دباؤ سے جسم پھٹنے کی اذیت بھی جاتی رہی تھی۔ انور کے ساتھ چلتے ہوئے اب اس پر مکمل بحالی تھی اور اپنے کو ہر طرف سے ہلکی پھلکی پا رہی تھی۔

—— ٭ ——

بے سمتی

میں اپنے خیالات پیچھے چھوڑ آیا ہوں

تیز دوڑتے ہوئے اس دَور کی وجہ سے یہاں پہنچکر اور اپنے ذہن اور خیالات سے
آگے نکل آنے پر میں ایک انجانی خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ خیالات اور ذہن ابھی تک دیں ہیں
اور سوچ کی رفتار انتہائی کم ہے، ابھی انھیں مجھ تک پہنچنے میں نا جانے کتنا عرصہ لگے گا۔
اس خوشی کے عالم میں خوش لباس، چست اور باوقار لوگوں کے اس سمندر کے بیچوں بیچ
کھڑا میں اِدھر اُدھر بے ترتیب نظروں سے دیکھتا ہوں۔

اونچی اونچی عمارتوں کے بیچ، ہموار اور چمکیلی سڑک پر تیرتی ہوئی لمبی گاڑیوں
میں بیٹھے ہوئے سجے سجائے لوگ، فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگ، تیز رفتار مگر
با اُصول ٹریفک، بڑے بازار میں خوشنما دکانیں، ہر شخص معروف، نہ فٹ پاتھ

یہ فضول مجمع، نہ سڑک پر کسی لڑکی کے دیکھنے کے لئے نٹھالی لوگوں کا کھڑا ہو جانا۔ یہ سب اس وقت مجھ سے لاتعلق اور میرے لئے اجنبی اجنبی سا ہے اور میرے ضمیر کے صفحے پر ثبت ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن کسی نے ابھی تک مجھے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا، یہ احساس مجھے اذیت پہنچا رہا ہے اور میں اپنی تنہائی پر پسینہ پسینہ ہو رہا ہوں شاید انھیں دوسروں سے زیادہ اپنے آپ سے دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ وہاں کسی ایسے حیران و پریشان شخص کو دیکھ کر کئی لوگ خود بخود مدد کے لئے قریب آ جاتے ہیں ایسے ماحول میں الفاظ میری زبان پر آ کر رہ جاتے ہیں اور مجھے اس قوم کی طرف بڑھتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا ہے کہ میں کسی دکان کی طرف، کسی عمارت میں جانے کے لئے کسی سے بات کرنے کے واسطے اگر قدم بڑھاؤں تو یہ سڑک میرے قدموں کے نیچے سے کہیں سُرک نہ جائے۔ اس پُر رونق ماحول میں رہتے ہوئے بھی میں خود کو بڑا فضول اور غمگین محسوس کر رہا ہوں اور مجھے یہاں کی آسودگی کا احساس تک نہیں ہو رہا ہے۔ یکایک میں اس اجنبیت کی کیفیت کی وجہ سے اپنی اُسی اپنائیت کے لئے پھر ترسنے لگا کیونکہ میں اُسی ماحول کا عادی ہوں اور شاید اسی لئے مجھے ابھی تک انتظار ہے اپنے ذہن، اپنے خیالات، اپنی سوچ کا۔

میرے اردگرد لوگوں کا میلہ لگا ہُوا ہے اور ایسا میلہ ہمیشہ تنہائیوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ میں اپنی روح کی تنہائی محسوس کرتے ہوئے اس وقت اپنے قدموں پر جامد و ساکت ہو کر رہ گیا ہوں۔ پھر ایسے میں اچانک یہاں کے کسی رواں دواں سے ٹکرا کر میرا وجود ایک طرف ہو گیا کیونکہ میں اپنی زمین پر نہیں ہُوں اور اپنے مرکز سے دوری کی وجہ سے میرا وزن گھٹ گیا ہے۔ اس لمحے میں ان کے مقابلے میں بے وزنی کا شکار ہُوں، اس کا

ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح وہاں کے راستوں پر بلا مقصد اور بلا ارادہ وقت ضائع کرتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنے ذہن کو تھکانے کی عادت کی مجبوری میرے دامن میں بھی پڑی ہوئی ہے، میرے پاس یہی سوغات ہے جو وہاں سے چلتے وقت ساتھ لایا ہوں۔ اب وہاں ہر شخص گلیوں اور سڑکوں پر سرگردانی کرتے کرتے تھک چکا ہے اور آمنا سامنا ہو جانے پر ہر ایک دوسرے سے آنکھوں آنکھوں میں پوچھتا ہے کیوں گھوم رہے ہو، کہاں جا رہے ہو۔ دوسرا بھی یہی سوال کرتا ہے تو دونوں سر جھکائے پیشانی پر قطروں کے ساتھ جو ان کی آنکھوں میں آ جاتے ہیں، مخالف سمتوں پر چل پڑتے ہیں ایسی کشتی کی طرح جو سمندر کی لہروں پر محض ہچکولے کھا رہی ہو۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے لہروں کو آتے جاتے دیکھتے رہتے ہیں مگر کچھ کہہ نہیں سکتے۔ جب کوئی نئی لہر اٹھتی ہے تو کشتی میں بیٹھنے والے سوچتے ہیں کہ ممکن ہے یہ لہر کنارے تک لے جائے۔ پھر اس لہر کا زور کم ہوتا ہے تو دوسری لہر اس کو ختم کر کے کشتی کو نیا ہچکولا دیتی ہے۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے یہ سب کچھ سہمی سہمی نظروں سے بس دیکھتے رہنے کے عادی ہیں، ان کی آنکھیں اور کان کھلے ہوئے ہیں، زبان بند ہے۔

میں اس تیزی سے گزرنے والے کے راستے میں حائل تھا اسی لئے وہ مجھے دھکیلتا ہوا آگے نکل گیا، وہ بھلا میرا انتظار کیوں کرتا، انتظار تو میرا مقدر ہے۔ مجھے دھکیلنے والے کے پاؤں اس کی اپنی زمین پر ہیں اس کی زمین اس کے قدموں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے اس لئے وہ کبھی لڑکھڑا نہیں سکتا۔ وہ تو بس گزرا چلا جا رہا ہے۔ اس کو آج تک کوئی نہ پابند کر سکا اور نہ ٹھہرا سکا۔

زندگی مجھے کھینچ رہی ہے۔ اس کے باوجود میں اپنے اندر بے اطمینانی، خوف، عدم اعتماد

کے بوجھ کی وجہ سے پیچھے رہا جا رہا ہوں اور زندگی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کشمکش میں میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر کہیں بکھر نہ جائے۔ اسی کم مائیگی کو لئے یہاں کھڑے کھڑے میں حیرت کے گہرے پانیوں میں ڈوبا چلا جا رہا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ڈوب کر انجانی تہہ میں نہ چلا جاؤں جہاں ریزہ ریزہ ہو کر سمندر میں گم ہو جاؤں اور پھر ماحول میں کبھی نہ آئے ہوئے کی مانند ہو جاؤں۔

مجھے اچانک ہال کی جانی پہچانی آوارہ بو محسوس ہوئی تو میں نے اپنی آنکھوں میں پہچان کے قطرے ٹپکا کر دیکھا کہ وہ آ گئے ہیں، ان کے کاندھے یوں جھکے ہوئے ہیں جیسے سر پر منوں بوجھ اٹھائے لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے ہوں اور ان کے چہروں پر ابھی تک پریشانی اور بدحالی اسی طرح چھائی ہوئی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں ان کے چہروں پر وہاں سے زیادہ ناآسودگی اور تھکن کی گرد جمی ہوئی ہے۔ جڑ اصل مٹی سے علیحدہ نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ صحیح مٹی نہ ملے تو پودا پنپتا نہیں اور پتے، پھل، پھول سب ہی سوکھ کر جھڑنے لگتے ہیں۔ پھول شاخ پر ہی بھلا لگتا ہے، علیحدہ ہوتا ہے تو روند دیا جاتا ہے یا خود ہی مرجھا جاتا ہے۔ ان کا لباس، چال ڈھال اور رنگ ڈھنگ سب کچھ وہی ہے اسی لئے ان میں سے کوئی سڑک پر جلتی ہوئی سگریٹ پھینک رہا ہے، کوئی خالی پیکٹ تو کوئی اپنے اندر کی گندگی نکالنے کے لئے جگہ جگہ تھوک رہا ہے۔ شاید یہ وقت سے پہلے ہی یہاں آ گئے ہیں انہی بے شاخ پتوں کی طرح جو جڑ سے علیحدہ ہو کر سوکھ جاتے ہیں اور ذرا سی ہوا سے کبھی ادھر ادھر لڑھک کر محض بے مقصد آوازیں پیدا کرتے پھرتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود فطری طور سے اب میں خوش ہو گیا ہوں کہ چلو یہ آ گئے ہیں، میرا ذہن آ گیا ہے، میرے خیالات آ گئے ہیں۔ ان کے آنے سے میری اجنبیت کا احساس جاتا رہا اور میرے بندھے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے کیونکہ ان کے اور میرے درمیان معلوم کا رشتہ یہاں بھی

اُسی طرح برقرار ہے۔

زندگی اور آدمی میں کم ہی بنتی ہے وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ روٹھے رہتے ہیں۔ یہ لوگ لہروں کے نئے ریلے کے مقابلے کی اپنے اندر ہمت نہ پاتے ہوئے تنکے کے سہارے سہارے یہاں چلے آتے ہیں اور یہاں آکر بھی یہ زندگی کو منانے میں مصروف نظر آتے ہیں انھیں زندگی کو منانا نہ آتا تو ابھی تک وہاں زندہ کیسے رہتے اب یہاں یہ اُس زندگی کی تلاش میں آئے ہیں جو ان سے کبھی نہ روٹھے۔ جس کے تصور میں اپنے گھر کی دیواریں اُٹھاتے اُٹھاتے میں خود بھی یہاں آگیا ہوں۔ ان کی اور میری جڑیں اس نئی جگہ بیٹھنے میں دقت محسوس کر رہی ہیں۔ یہی کسمپرسی دیکھتے ہوئے اب ان کے چہروں پر جو ابھی تک مجھ سے لاپرواہ میرے قریب ہی سے گزر رہے تھے، ناگواری اور کراہیت کے تاثرات نے لے لی۔ یہ وہ پتھر ہیں جن سے خیالی گھر کا تصور ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ وہاں سے چلتے وقت میری جو خواہشات تھیں وہ اب میرے اندر سلگنے لگیں اور اس لمحے میں دوہری کیفیت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔

میرے اوپر بادل کے ایسے بانجھ ٹکڑے اس طرف سے اُس طرف نہایت آسانی سے آجا رہے ہیں جن سے زمین پر کبھی ایک بوند تک نہیں برسی اور نیچے میرے سامنے ایک وسیع زور آور سمندر ہے جس کے ایک طرف یہاں میں کھڑا ہوں جہاں سورج کی سُنہری کرنوں کی چمک نے مجھے اپنی طرف کھینچ رکھا ہے اور جن کے جال میں بندھا میں یہاں گم سُم سہما ہُوا کھڑا ہوں۔ اس وقت میرے ذہن کے جو گھٹے ہیں یہاں کی تیز ہوا سائیں سائیں کرتی آر پار گزر رہی ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا وجود مجھ سے علیٰحدہ ہو کر دُور کھڑا مجھ پر ہنس رہا ہے۔ دوسری طرف اُدھر کنارے کی کیچڑ میں پھنسے ہوئے بہت سے لوگ اِدھر ہی حسرت سے دیکھ رہے ہیں جس کی چھینٹیں میری پیشانی پر ابھی تک موجود ہیں۔

اُس کیچڑ سے پاؤں نکالنے اور قدم آگے بڑھانے کی دُشواریوں کے باوجود میں یہاں آپہنچا ہوں۔ میں اپنے اُنہی خیالات کے راستے اپنے وجود کے گہرے غار میں اُتر چکا ہوں، اپنے وجود کے اِس غار سے باہر آنا بھی چاہوں تو نہیں آسکتا کیونکہ وہ زینہ جو ذہن سے میرے وجود تک پہنچا ہے، ہٹ گیا ہے۔ اِس لئے میں اپنے آپ میں اتنا گھُس چکا ہوں کہ گھٹن سے گھبرا کر چیخ بھی نہیں سکتا۔ اب اِس ماحول سے الگ تھلگ غلاظت کے انبار کی مانند تنہا کھڑا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ان کی طرح فی الحال میرا بدن محض ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گیا ہے۔ دراصل میں بھی ابھی وہیں ہوں جہاں سے چلا تھا ــــ!!!

ــــــــ۔ــــــ

لمحے کا بوجھ

اس نے چاروں اُور دیکھا اور سوائے اپنے اُسے کوئی نظر نہ آیا۔ اسے ڈر لگنے لگا کیونکہ تنہائی میں اُداسی ہوتی ہے اور اُداسی سے ڈر لگتا ہے۔ اس نے اپنے وجود کو انسانوں کے اس سمندر میں اس جہاز کی مانند پایا جو سمندر کے پھیلاؤ اور گہرائی میں داخل ہو گیا ہو مگر کوئی ساحل اسے اپنی طرف بُلا کر ٹھہرنے کی اجازت دینے کو تیار نہ ہو۔ چلتے پھرتے سانس لیتے ہوئے لوگوں کے اس ہجوم میں سے امینہ بیگم کی دی ہوئی اپنائیت نے اس کی روح کو جھنجھوڑا تو بیتی زندگی کے نقوش اس کی نگاہوں سے بڑی حد تک مٹ گئے اور بہن کہہ کر امینہ بیگم نے اس کی زندگی کی سپاٹ چٹانوں پر زندگی کی اُمنگ پیدا کر دی۔ لفظ بہن کی اس سادگی سے دونوں کی راہ اس قدر آسان ہو گئی کہ ان کے درمیان کبھی کسی شک و شبہے کا اندھا موڑ نہیں آیا، نہ تو خوشی دیر تک رہتی ہے اور نہ اُداسی بلکہ ایسی ہستی ہمیشہ کے لئے

دل میں محفوظ رہتی ہے۔

اس نے اپنے وطن کے مشرقی حصے کی اسی سرزمین پر سانس لیتے ہوئے، لوگوں سے ملتے جلتے یہاں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اور یہاں کی آب و ہوا میں اپنی جوانی گزاری تھی۔ یہیں سے اسے بہت سی خوشیاں ملیں۔ بہت سے دکھ بھی اٹھائے۔ یہیں کے لوگوں سے محبت کی۔ ان ہی لوگوں نے اسے محبت دی۔ اس کا شوہر اس زمین کی محبت میں موت کے منھ میں گیا اور اس کے ماں باپ اس سرزمین کے لئے مارے گئے مگر اس نے اُف نہ کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا ماضی صرف اس کے لئے اہمیت رکھتا ہے، دوسروں کے لئے اس کے کوئی معنی نہیں۔ اور جب امینہ بیگم نے اس کی ڈھارس بندھائی تو وہ سب کچھ بھول گئی۔ دونوں اپنی تمام تر توجہ صرف بچے پر ہی مرکوز کئے رہتیں۔ اسی لئے کسی کو آج تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ اصل میں اس بچے نے ان میں سے کس کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ خود یہ دونوں بھی فیصلہ نہ کر پاتیں کہ بچے سے کون زیادہ پیار کرتا ہے وہ اس جھنجھٹ میں پڑنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ اور نہ اس کی ضرورت ہی محسوس کرتیں۔ دونوں ہی بچے پر اپنی ممتا نچھاور کر کے اپنے تئیں مطمئن تھیں۔ بچہ بھی دونوں ہی کو ماں کہہ کر پکارتا۔

وہ اور امینہ بیگم پہلے پہل پڑوسی تھیں لیکن بچے کی محبت میں درمیان کی دیوار گرادی تھی۔ اب مکان ایک ہی تھا بلکہ انھوں نے آپس کی ہر تفریق کی دیوار گرادی تھی۔ دونوں ایک ہی رنگ میں رنگ گئی تھیں اور بچے کی ماممتا نے تو دونوں میں اور بھی قربت پیدا کر دی تھی۔ پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ معاشرے، جسم اور محبتوں کے رشتوں کی ڈوری کٹ کر رہ گئی۔ سب ہوا کے تھپیڑوں میں معلق لٹک کر رہ گئے اور جب نفرت اور تعصب کے

جھگڑے چلے تو ان کے ذہن آپس میں ٹکرا کر گتھم گتھا ہو گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے انسانوں کا انسانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کوئی تعلق تھا تو اب ختم ہو گیا ہے۔ انسان ختم ہو جاتا ہے اور اپنے پیچھے اپنی یادوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا تسلسل چھوڑ جاتا ہے۔ برسوں ساتھ رہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہی بنے رہے۔ ان کے جسم ان کے ذہنوں سے علیحدہ تھے۔ جسم قریب بھی ہو جائیں تو قربت نہیں ہوتی۔ ذہن کے قریب ہونے سے ہی اصل قربت ملتی ہے۔

ان دنوں وہ بچے کو درمیان میں لے کر سوتیں اور اپنی نظروں سے اسے ایک لمحے کے لئے بھی دور نہ کرتیں۔ وہ اس خیال سے بھی کانپ جاتیں کہ ان کے بچے کو ان کی گود سے چھین کر ان کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے چیر کر پھینک دیا جائے گا۔ جب بھی ان کے گھر کے سامنے شور برپا ہوتا اور چیخ پکار ہوتی وہ لرز جاتیں۔ ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتیں اور بچے کو مضبوطی سے ممتا کی گرفت میں لے لیتیں۔ بچہ حیرت زدہ تھا کہ یہ اسے اس طرح ہر لمحے اپنے درمیان کیوں رکھتیں ہیں باہر کیوں نہیں جانے دیتیں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ باہر نفرت کی زبان میں شور مچ رہا ہے۔ وہ اس زبان کو نہیں سمجھتا تھا۔ وہ تو اب تک پیار اور محبت کی زبان ہی سنتا آیا تھا جو یہ دونوں بولتی چلی آئی تھیں۔ وہ بھی یہی زبان سمجھتا اور بولتا تھا۔ اس سب کے بارے میں وہ امینہ بیگم سے پوچھتی اور جب کوئی جواب نہ پاتی تو پھر خود سوچتی۔ یہ سب کچھ لاعلمی میں ہی ہو رہا ہے۔ یہ سب لاعلمی میں پیدا ہوئے، لاعلمی میں ہی زندہ رہے اور اسی میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو کر ایک دوسرے کو موت کے اندھیروں میں دھکیل رہے ہیں۔ یہ دوسروں کی موت کے اندھیروں میں جھانک کر شاید اپنے چہرے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور اب اس پوری سرزمین پر قبریں ہی قبریں ابھر آئیں گی۔

انسانوں کا جلوس اپنی اپنی قبروں میں اتر رہا تھا۔ یہاں کی

سرزمین کا ہر ذرّہ یہاں کے بسنے والوں سے گویا اب اپنے وجود کی قربانی مانگ رہا تھا اور محبت جو ایک ایسی کنجی ہوتی ہے جس سے ہر دل کا دروازہ کھلتا ہے ان سے چھین لی گئی تھی۔ اب اس کے ذریعہ تمام دلوں کے دروازے بند کرنے کا کام لیا جانے لگا تھا۔ عوام ایک ایسا درخت تھے جس کی جڑیں سیاست کے پہاڑ کے سینے میں کافی دور تک پھیلی ہوئی تھیں اب اوپر سے اس کی شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں تھیں ہمیشہ کی طرح پہاڑ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا لیکن درخت کا نام ونشان مٹنے لگا۔ یہی پہاڑ اس وقت ان دونوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس گروہ کا سرغنہ تو ان کا پڑوسی ہی ہے جو اب تک انہیں ماں کے برابر سمجھا تھا اسی طرح عزت بھی کرتا تھا۔ انہوں نے اسے واسطے دیئے لیکن وہ قہقہے لگاتا رہا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں نفرت اور درندگی بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں لرزنے لگیں اور بچّہ دہل گیا۔ انہوں نے بچّے کو اپنے بیچ میں سمیٹ لیا۔

"بتاؤ یہ بچہ کس کا ہے؟"

"یہ بچّہ میرا ہے۔ رحم کرو۔" اس نے لرز کر کہا۔

"یہ بچّہ میرا ہے اسے مت مارو۔" امینہ بیگم بولی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ تلخ اور بھاری لمحات اس پہاڑ کے بڑے بڑے پتھروں کی صورت میں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی روح پر گر رہے ہوں۔

"سچ سچ بتاؤ یہ بچّہ کس کا ہے، ورنہ اس کے ساتھ ہی تم دونوں کو بھی ختم کردوں گا۔"

"یہ بچّہ میرا ہے۔"

"میرا ہے۔"

''امینہ بیگم تو اپنی ہی ہے مگر تو ـــــ تو ابھی تک کیسے زندہ ہے۔ تجھے اس سرزمین پر رہنے کا حق نہیں۔''

اس لمحے اُسے اس زمین کی خاطر اپنے خاندان، اپنے ماں باپ اور شوہر کا جان دینا یاد آگیا ذہنوں کی یہ اونچ نیچ اس وقت نہیں تھی۔ نہ اس کے بعد اتنے برسوں رہی۔ اب پیدا کر دی گئی تھی۔ ماں بہن کی گالیاں دے کر وہ غرّایا۔

''پہلے تو میں تم دونوں کے سامنے اس بچے سے نمٹوں گا یہ بچہ آخر کس کا ہے؟''

''میرا ہے۔ اسے کچھ مت کہنا'' امینہ بیگم گھگھیائی۔

''یہ میرا ہے ـــــ میرا ـــــ'' اس نے بین کیا

نفرت کا یہ پہاڑ تفریق کی آواز میں دھاڑا ـــــ ''تو تم نہیں بتاؤ گی کہ یہ حرام کا پلا کس کا ہے میں اسے ابھی تمہاری نظروں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہوں ـــــ'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور بچے کو زبردستی اس سے چھیننے لگا لیکن لاشعور میں سلگتی ہوئی نفرتوں کی یہ آگ کبھی قتل و غارتگری سے بھی بجھی ہے۔ اس کے لئے تو پوری نسل کے آنسوؤں کا سمندر چاہیئے۔ اس نے اس نسل کے ان ہی آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر بچے کو جلدی سے امینہ بیگم کی طرف دھکیل دیا اور چلّائی۔

''یہ بچہ امینہ بیگم ہی کا ہے۔ میرا نہیں۔ نہیں۔''

اُسی لمحے امینہ بیگم بھی بچے کو اپنے بازوؤں میں تھامے ہوئے ہنستی ہوئی وہاں سے بھاگ کر جانے کہاں غائب ہو گئی۔

بگولا

"اری عصمت اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے مہمان آنے ہی والے ہیں اور تُو ابھی تک پلنگ پر پڑی ہے جلدی تیار ہو جا لڑکی" عصمت کی ماں دُور سے چلّا رہی تھی عصمت بغیر جواب دیئے کھڑی ہو گئی۔ اُس نے دیکھا، صبح پہاڑوں کی چوٹیوں سے جھانکنے لگی تھی۔ ماں نوکروں پر چیختی ہوئی نکل گئی۔ اُس نے ایک لمحے آنے والے مہمان کے بارے میں سوچا اور شرم اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے پسینے میں شرابور ہو گئی۔ جن خواہشات کو وہ پیچھے دھکیل چکی تھی وہ ایسے وقت پھر اُبھرنے لگیں۔ سامنے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے سر میں کہیں کہیں چمکتے ہوئے سفید بالوں کو دیکھ کر اس کے جذبات میں یکایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اُسے اس وقت اپنے ماں باپ کی خوشی پر ترس آنے لگا اور ان کی بے چارگی کا سبب اپنے آپ کو سمجھنے لگی۔ اس کی زندگی اس ریگستان

کی طرح تھی جس پر سال بھر سورج کی کرنیں عموداً پڑتی ہیں، میلوں تک کہیں سایہ نظر نہ آئے، حدِ نگاہ تک ویرانی کی حکومت ہو۔ ایک خیال آتے ہی اُسے ایک جھرجھری آئی۔ اگر اس مرتبہ بھی۔ اس مرتبہ بھی۔ اس کے بعد وہ کچھ اور نہ سوچ سکی۔

عصمت کے سر میں جب کسی سفید بال کا اضافہ ہوتا تو اس کی ماں ایک سرد آہ بھرتی اور منہ پھیر کر دوپٹے سے بھیگی آنکھوں کو خشک کر لیتی۔ پہلے پہلے عصمت اپنے کمرے میں جاکر آنسوؤں کے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کرتی مگر روک نہ پاتی۔ پھر جیسے آنکھوں میں آنسوؤں کی کمی سی ہوتی گئی، وہ انجانے جذبے کے تحت ماں کو دیکھتی اور پھر کسی کام میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی۔ اُسے اکثر یوں لگتا جیسے ابھی ابھی کوئی بے حد اہم کام کرنا ہے جو ذہن سے اُتر گیا ہو ایک نامعلوم سی خلش ذہن سے چپک کر رہ جاتی۔ احساسات کے نازک آب گینوں میں بال پڑ گئے تھے۔ ہر لمحے اسے اپنی ہی پیدا کردہ تنہائی کاٹنے کو دوڑتی جو اس کی قسمت میں گھل مل گئی تھی۔ وہ ماضی کی ناچاریوں اور بے بسی کا ایک اُجاڑ مکان بن کر رہ گئی تھی۔ زندگی کا قافلہ گزرتا چلا گیا اور اس کی کاروان سرائے ویران ہوتی چلی گئی۔

اس کی زندگی میں کلیاں چٹکتی تھیں، پھول کھلتے تھے اور اس کے وجود کے ارد گرد ہوا میں ان کی خوشبو بسی رہتی۔ اس نے اپنی علیحدہ دُنیا بسا رکھی تھی۔ گھر کی خوشحالی اور ماں باپ کے لاڈ نے اُسے اور بھی آزاد بنا دیا تھا۔ اس نے اپنی دُنیا میں ایک ہیولا بسا رکھا تھا۔ وہ اپنے اس ہیولے کو خواب میں دیکھتی، خیال میں پالتی، تصور میں سجاتی اور تخیل میں سنوارتی۔ جب وہ تنہا ہوتی تو وہ اس کے دھیان کی سیڑھیوں پہ چپکے چپکے دبے پاؤں آتا۔ جانے پہچانے قدموں کی چاپ اس کی سوچوں کے پس منظر سے اُبھرتی ہوئی اس کے وجود تک

پہنچتی تو وہ محسوس کرتی کہ کوئی اس کے پاس ہی آ کھڑا ہوا ہے وہ اُسے دیکھتی رہتی، خوبصورت تعلیم یافتہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلیٰ منصب والا۔ بی اے کے زمانے میں اس کے لئے ایک رشتہ آیا۔ ایم اے پاس لڑکا اچھا خاصا تھا۔ باپ نے اپنی مرضی ظاہر کی تو عصمت نے پُر زور مخالفت کی، اُسے تو ایم اے کرنے کی دُھن تھی۔ ماں نے بھی لڑکی کا ساتھ دیا۔

"میری عصمت کو رشتوں کی کیا کمی ــــ"

اور پھر عصمت کا تو اپنا ایک الگ معیار تھا۔ اس معیار کو دل میں چھپائے وہ یونیورسٹی پہنچ گئی، اُسے سہیل، انور اور شیرازی کا خیال آ گیا۔ یہ سب اس کے نزدیک آنے کا کوئی بہانہ نہ چھوڑتے، ان کا خیال آتے ہی وہ مسکرا دی۔ انور نے اپنے اشعار میں اُسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی غزلوں میں اکثر وہ عصمت کا تذکرہ کرتا۔ ان اشعار کو پڑھ کر اس کے بدن میں لہریں سی پیدا ہونے لگتیں، ہونٹ پھڑ پھڑانے لگتے لیکن وہ انجانی سی بنی رہتی۔ شیرازی نے تو شادی تک کے لئے اس سے کہا وہ کٹ کر رہ گئی۔ اس بے باکی پر اُسے طیش بھی آیا۔ سہیل کا خیال آتے ہی اس کے لبوں پر ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اس کے لئے دل کے کسی گوشے میں جگہ ضرور پاتی تھی مگر اس کے خیالات عجیب سے تھے۔ وہ کہتا:

"یونیورسٹی کی لڑکی سے دوستی کی جا سکتی ہے اس کے ساتھ تفریح کی جا سکتی ہے مگر وہ مرد کو سکون نہیں دے سکتی"

سہیل کی انہی باتوں سے وہ اندازہ لگا لیتی کہ وہ اس کا ذہن پڑھ لیتا ہے۔ اس کے سامنے وہ مجرم سی بنی رہتی، پتہ نہیں کس لمحے سہیل اس کی کمزوری پکڑ لے اور پھر اس نے سہیل کا خیال ذہن سے کھرچ ڈالا۔ وہ سوچتی بھلا راستہ چلنے والے کا بھی کبھی ہاتھ تھاما

جاسکتا ہے وہ تو پاس سے گزر جاتا ہے اور کبھی پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس سے تعلق تو بس اتنا ہوتا ہے کہ نگاہیں اُٹھائیں ایک لمحے کے لئے رُک گئے اور پھر آگے چل نکلے جیسے دو چیونٹیاں چلتے چلتے ایک دوسرے سے کانا پھوسی کر کے پاس سے گزر جاتی ہیں۔ زندگی کی راہ پر ہر لمحے ہر آن دھڑکن بڑھتی جاتی ہے لیکن یہ راہ اس قدر مصروف ہوتی ہے کہ دھڑکن بڑھنے سے کوئی کہانی جنم نہیں لیتی۔ پھر فوراً ہی وہ اپنے خیالات کے ہیولے سے ان سب کا موازنہ کرتی تو یہ سب اس کے آگے ہیچ نظر آتے اور پھر یہ سب وقت کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کے پس منظر میں گرتے رہے۔ اس کی یادوں کا یہ پس منظر انہیں نگلتا رہا۔

وہ اپنے خیالات کے ہیولے کو سینے سے لگائے زندگی کی پگڈنڈی پر چلتی رہی۔ زندگی کے ہر موڑ پر تنہا کھڑی ہر آنے جانے والے کو دیکھتی رہی اور پہچاننے کی کوشش کرتی رہی کہ کسی میں اس کے ہیولے کی مشابہت موجود ہو۔ اُسے یقین تھا کہ کسی موڑ پر اس کے خیالات کا ہیولا اس کا انتظار کرتا ہوا ملے گا۔ ماں باپ مطمئن تھے کہ اس نے تعلیم مکمل کر لی ہے۔ اب جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا ہی رشتہ ملے گا لیکن وہ زندگی کی پگڈنڈیوں پر اکیلی ہی چلتی رہی فاصلہ بڑھتا رہا۔ وہ دیکھتی اس کا ہیولا سامنے کھڑا ہے مگر چلتے چلتے وہ تھکتی جا رہی تھی وقت کو بھی پر لگ گئے تھے۔ اس انتظار کی یکسانیت سے اُکتا کر اور اپنے آپ کو بہلانے کے لئے اس نے ایک کمپنی میں ملازمت کر لی۔ ماں نے مخالفت نہیں کی اور باپ کو یہ کہہ کر چُپ کرا دیا کہ اس کا دل ہی بہلتا رہے گا۔ عصمت کے اس کمپنی میں داخل ہوتے ہی ایک دَم ایک تبدیلی آ گئی۔ یہ تبدیلی خود عصمت نے بھی محسوس کی جہاں پہلے لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے اونگھتے رہتے تھے اب ان میں زندگی کی تازگی

آ گئی تھی۔ یہ تبدیلی محسوس کر کے آخر ایک روز صدیقی صاحب نے اس سے کہہ دیا۔

"مس عصمت آپ نے تو اس دفتر کی کایا ہی پلٹ دی۔" وہ مسکراتی ہوئی واپس اپنی سیٹ پر آ گئی۔ کام کرتے کرتے کبھی نظر اُٹھا کر اردگرد نظر ڈالتی تو کئی نظروں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتی۔ اس کے گلابی چہرے پر شفق اُبھر آتی، اسی شام تھکی ہاری دفتر سے گھر پہنچی تو معلوم ہوا اس کے پاس ہی بیٹھنے والے خالد نے پیغام بھجوایا ہے اُسے غصہ آ گیا، اس نے سوچا کہ دفتر میں کیسا چُپ چاپ اور نیچی نگاہیں کئے بیٹھا رہتا ہے۔ ماں باپ نے اس کی رائے لی تو اس کے سامنے اس کا ہیولا آ گیا اور عصمت نے فوراً انکار کر دیا۔ پھر عصمت نے دفتر میں دیکھا کہ خالد نے اپنی سیٹ دوسرے کمرے میں لگوا دی۔ سب اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی حماقت کر رہا ہو کیونکہ ہر شخص اپنی سیٹ وہیں لگوانا چاہتا تھا مگر وہ بے پروائی سے اپنے کام میں لگی رہی۔ پھر صدیقی صاحب کے پاس ایک فائل لے کر کسی کام سے چلی گئی وہ دیکھتے ہی خوش ہوئے جیسے اس کا انتظار کر رہے ہوں۔

"میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا" صدیقی نے ملائمت سے کہا۔ عصمت نے صدیقی کو بھرپور نظر سے دیکھا وہ بھی اُسی کو دیکھ رہا تھا اس کی تیز نگاہوں نے عصمت کی رُوح کو جھنجھوڑ دیا۔ اس کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ کئی دنوں سے وہ صدیقی اور اپنے ہیولے کا موازنہ کر رہی تھی۔ صدیقی بالکل اس کے معیار کی طرح وجیہہ پڑھا لکھا اور اعلیٰ منصب والا تھا۔ اُسے اپنے سامنے اپنے خوابوں کا ہیولا بیٹھا نظر آیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اور یہ کہنے کے لئے کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں۔" خود عصمت بھی اس سے کچھ سُننا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے خوابوں کا

ہیولا اب مجسم بن جائے اور اسے اپنے ساتھ کہیں دُور لے جائے۔ عصمت کے چہرے پر تجسس کے تاثرات نمایاں تھے جو شاید صدیقی نے پڑھ لئے۔

"میں آپ سے شادی......"

اس لمحے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے مندر میں گھنٹیاں سی بج رہی ہوں اور وہ اپنے جذبات کی متلاطم موجوں پر بہتی چلی جا رہی ہو۔ اس کے آگے عصمت میں سننے کی تاب نہیں تھی، وہ کمرے سے بھاگ گئی۔ اس کے روئیں روئیں سے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں، وہ سوچنے لگی صدیقی اس کے لاشعور کی بات کیسے سمجھ گیا جو کبھی اس کے اپنے شعور میں بھی نہیں آئی تھی شاید خیالات اور رُوح کا سفر ایک ہی ہوتا ہے لیکن صدیقی کے ایک ہی جملے سے اس کے لاشعور کی ساری خواہشات اس کے شعور کے دامن میں آ پڑیں۔

چھٹی ہونے پر صدیقی نے اُسے اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی تو وہ راضی ہو گئی۔ اس سے پہلے اگر صدیقی اس سے یہ کہتا تو شاید وہ کبھی نہ مانتی اور صاف انکار کر دیتی۔

اس کے بعد نا جانے کیوں چھٹی ہونے کے وقت وہ روز یہی چاہتی کہ صدیقی اسے اپنے برابر بٹھا کر لے جائے اور یہ سوچتے ہوئے اسے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا کوئی خوف بھی محسوس نہ ہوتا۔ ایسی ہی سوچوں میں گھری اپنی میز کا سامان سمیٹ رہی تھی کہ نا چاہنے کے باوجود اس نے اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے صدیقی کو اُنہی نظروں سے دیکھا۔ اُس نے لمحے بھر کو ٹھہر کر اسے پھر وہی پیشکش کی تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے غیر شعوری طور سے جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ صدیقی کا گھر راستے میں تھا اس نے کہا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرا گھر دیکھ لیجئے اور ایک پیالی چائے بھی، اس کے

بعد میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

وہ انکار یا اقرار بھی نہ کر پائی تھی کہ صدیقی نے کار اپنے گھر کے سامنے روک دی وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور صدیقی نے عصمت کو ایک سجے سجائے کمرے میں بٹھا دیا۔

"آپ تنہا ہی رہتے ہیں"، عصمت نے پہلی بار پوچھا

"ہاں" صدیقی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا عصمت کو جانے کیوں، اس پر ترس آیا، صدیقی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"شادی سے پہلے ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔"

عصمت کے گالوں پر قوس و قزح لہرا گئی جانے کیسے وہ اس کے دل کی بات لے اُڑا تھا، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ صدیقی نے اپنے بازو اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس پھندے کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر اس کی پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح کمر بل کھا کے رہ گئی۔ اُسے اپنے خیالوں کا ہیولا دھندلا ہوتا نظر آیا۔ صدیقی کی آنکھوں میں اس کے ہیولے کی جگہ صدیقی خود جھانک رہا تھا۔ وہ اس کے وجود کی صاف و شفاف چادر پر اپنے قدموں کے نہ مٹنے والے نشان چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ اسے ایسی قبر بنا دینا چاہتا تھا جہاں آئے دن لوگ فاتحہ پڑھنے آتے ہوں اور وہ لمحے بھر کی چھاؤں کی خاطر اسے زندگی بھر کے لئے تپتی دھوپ میں جلتا ہوا چھوڑ جانا چاہتا تھا۔

"اتنے بڑے افسر کی بیوی تم آسانی سے نہیں بن سکتیں۔"

صدیقی نے اس کی ذات کے بارے میں اس کے جسم کے لحاظ سے رائے قائم کی اور اس کی رُوح کو اس نے مادے کی ترازو میں تولا۔ صدیقی کی فطری خصلت اُبھر آئی جو مرد کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ عصمت اپنی عصمت ہی کی قوت سے اُسے دھکیل کر علیحدہ ہو گئی۔

اور اس کو اس کے اندر کے اندھیرے میں لڑکھڑاتا چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ گھر پہنچ کر وہ اوندھے منہ پلنگ پر گر پڑی اور بہت دیر تک روتی رہی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کا ہیولا اس پر ہنس رہا ہو۔ اور پھر اگلے روز سے اس نے دفتر جانا بند کر دیا، ماں باپ نے بھی زیادہ نہیں کریدا۔

عصمت زندگی کی پگڈنڈی پر تھکے تھکے قدموں سے چلتی رہی۔ اس کی زندگی کی شاہراہ پر مختلف سمتوں سے پگڈنڈیاں آتیں جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر جاتیں۔ ہیولا اس کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا جیسے جیسے وہ اس کے پیچھے چلتی اس پر کہرسی چھانے لگتی۔ ایک روز وہ ایک مصروف سڑک سے گزر رہی تھی تو اُسے سہیل، انور اور شیرازی تینوں ساتھ ہی ساتھ مل گئے۔ معلوم ہوا شیرازی اور انور کی شادی ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں اور وہ بہت خوش ہیں۔ سہیل کے ابھی تک وہی خیالات تھے۔ اس نے وُہی بات پھر کہی۔

"پہلے تو لڑکیاں اپنے معیار کے چکر میں کسی کو اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتیں لیکن پھر ان کا یہ معیار انہیں کبھی نہیں ملتا۔"

عصمت کو محسوس ہوا جیسے سہیل نے اس کے دل میں چٹکی بھری ہو اور اس کے اندر چھپے ہوئے چور کو پکڑ لیا ہو۔ وہ گھبرا کر اُن سے رخصت ہوئی اور ایک کافی ہاؤس میں گھسی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ خالد کسی لڑکی کا ہاتھ تھامے نکل رہا تھا۔ اس نے اپنے ہیولے کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو کہیں کھو گیا تھا۔ اُس لمحے وہ اس ابدی تنہائی کو محسوس کرنے لگی جو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوتی ہے۔ جو عمر بھر سائے کی طرح ساتھ رہتی ہے جس کا تعلق ہمارے ماحول سے نہیں بلکہ ہماری رُوح سے ہے۔

وہ سوچتی ہم سب ایک دوسرے کے لیے ازلی و ابدی اجنبی ہیں۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر آتی اور آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے سر میں سفید بال، چمک رہے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کو دونوں ہاتھوں میں لے کر نچوڑ دیا ہو اور اس کا خون قطرہ قطرہ اس کی روح پر گر رہا ہو۔

عصمت اپنی پرانی کتابیں جھاڑ رہی تھی کہ ماں آگئی۔ ماں کے لہجے اور چال میں اب وہ تیزی باقی نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔

"عصمت تم سے بات کرنی ہے۔"

"امّی مجھے معلوم ہے آپ کیا بات کریں گی"، اُس نے بے پروائی سے کہا۔ ماں کا دل بیٹھ گیا مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

"بیٹی ایک رشتہ آیا ہے۔"

"رشتہ، رشتہ۔ رشتہ" وہ جھنجھلا گئی "امّی رشتے آنے کب بند ہوں گے۔"

ماں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو بند ہو ہی گئے ہیں۔ ہم نے بہت سے اچھے اچھے رشتوں کو ٹھکرا دیا مگر اب سوچنا پڑے گا، ایک لڑکا ہے میٹرک پاس اور کلرک۔"

عصمت کو یوں لگا جیسے ایک سرد اور تاریک خلا میں معلّق ہو کر رہ گئی ہو۔ ماں کی انھی باتوں سے اکثر ایسی سوچیں چور راستوں سے اس کے دماغ میں داخل ہو جاتیں پھر یہ سوچیں یادوں میں ڈھل جاتیں اور وہ چاہتی کہ گزرا ہوا وقت واپس آجائے لیکن گزرا ہوا وقت تو ہمیشہ یادوں کی ایک حسین اور طویل داستان اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے

جس نے نشتر بن کر اس کے وجود میں بھی جنم لے لیا تھا۔ عصمت نے خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھا اور ایک کتاب کی گرد جھاڑتے ہوئے خاموش رہ کر اس نے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔

"شام کو وہ دیکھنے آ رہے ہیں" ماں کی آواز کسی گہرے کھنڈ سے آتی ہوئی لگی۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس کی ماں بھی اس کی زندگی کی کتاب سے گرد صاف کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ شام کو آنے والوں کے لیے خوب خوب اہتمام ہوا اور سلام کرنے کے لئے عصمت کو بلوایا گیا۔ عصمت نے کنکھیوں سے دیکھا لڑکا اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بکرا پیڑی میں لوگ جانوروں کو پرکھتے ہیں۔ اگلے روز ہی جواب نفی میں آ گیا۔ لڑکے کا کہنا تھا۔

"مجھے اپنی رکھوالی کے لئے بزرگ عورت نہیں چاہیئے"۔

عصمت کی ماں نے سر تھام لیا۔ عصمت خاموشی سے کوئی کتاب پڑھتی رہی جیسے اُسے کوئی افسوس ہی نہ ہوا ہو۔ مایوسیوں نے اس کے احساس کو ڈس لیا تھا۔ اس کی حیثیت ایسے جہاز کی سی تھی جس کی روشنیاں بجھ گئی ہوں جو سمندر میں مارا مارا پھر رہا ہو جو صرف اس سمت جاتا ہو جہاں کوئی اُسے خوش آمدید کہنے والا نہ ہو۔ وقت اندھیرے کو ساتھ لئے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ آخر میں ہم خود اس بے پایاں اندھیرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

پھر عصمت کے چچا نے بتایا کہ ان کا ایک دوست اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس رشتے پر راضی بھی ہے اور پہلے عصمت کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور آج اسی لئے صبح ہی سے عصمت کی ماں نے شور مچا رکھا تھا اور تیاری میں

کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ کچھ ملی جلی آوازوں سے عصمت کو معلوم ہوا مہمان آگئے ہیں۔
اس نے جھانک کر دیکھا صرف ایک آدمی چچا اور ابّا کے پاس بیٹھا تھا۔ سیاہ رنگت،
چھوٹا قد اور موٹا جسم، اس نے اپنے خیالوں کے شہزادے کو تصوّر کی وادیوں میں دُور دُور
تک تلاش کیا مگر اس کا کہیں پتہ نہ ملا۔ وہ سمجھ گئی اس نے چپکے سے کہیں دم توڑ دیا
ہوگا۔ وہ بھی اسے تلاش کرنے کے لئے اب تک زندگی کے ریگستان میں ننگے پاؤں
پیدل چلتی رہی تھی اور اب تھک چکی تھی زندگی سے، اپنے آپ سے، اپنے خیالات سے،
دُنیا سے، ہر چیز سے۔ اپنے وجود کا سارا بوجھ وہ اپنی ٹانگوں پر اُٹھائے پھرتی رہی۔
امّی کی آواز سے وہ چونکی اور حسبِ معمول اسے سب کے سامنے جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد مہمان
نے رُخصت چاہی۔ سب نے خوش اخلاقی سے رُخصت کیا۔ چچا مہمان کو باہر تک چھوڑنے
گئے۔ عصمت اپنے کمرے میں اُس اُمیدوار کی عدم اعتمادی کے احساس کے ساتھ آگئی۔ جو
نوکری کا انٹرویو دے کر کمرے سے نکل رہا ہو۔ کھڑکی کے پاس پردہ سرکانے کی غرض سے
گئی تو ماحول کی پوری تشنگی اس کی رُوح پر اُتر آئی وہ صاحب کہہ رہے تھے:

"دیکھئے لڑکی کی عمر بہت ہے۔"

اس لمحے عصمت کو اپنی نبضیں تھمتی ہوئی محسوس ہوئیں، اس کا دماغ کھمبوں کے
سر پر لپٹی ہوئی تاروں کی مانند سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں ایک دم
بہت ساری گھنٹیاں بجنے لگیں۔ آنکھوں کے سامنے گول دائرے گھومنے لگے اور
اسے یُوں لگا جیسے اس کے خیالات کا ہیولا اس کے سامنے کھڑا اس پر قہقہے لگا رہا ہو۔
"مگر آپ کو تو اپنے بچّوں کی دیکھ بھال کے لئے ان کی ماں کی ضرورت تھی۔"
چچا کی آواز کمزوری کی وجہ سے لرز رہی تھی، چچا کی اس بات پر ان صاحب نے

جواب دیا۔

"ٹھیک ہے مگر مجھے اپنے لئے بیوی بھی تو چاہیئے"

——— ⁂ ———

پہلی سے پہلے

دَروازے پر بالکل اپنی شخصیت کی طرح مدھم دَستک دیتے ہوئے اور چہرے پر اطمینان کے تاثرات پیدا کرنے کے لئے اُس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی وہ دَروازہ کھولے گی اُس کے چہرے پر سارا دُھواں چھوڑ دے گا، باہر سے آکر دَروازہ کھُلتے ہی وہ یہ حرکت ضرور کیا کرتا۔ لیکن دروازہ کھُلنے پر وہ چونک پڑا۔ سائرہ کو اُس حالت میں وہ بارہا دیکھ چُکا تھا مگر اس وقت تو اُسے یقین تھا کہ وہ اِنتظار سے بے چین ہو کر دَروازے پر ہی اُس کی راہ تک رہی ہوگی اور خوشی اور تجسس کے ساتھ اس کا استقبال کریگی۔ سائرہ کے اس غیر متوقع رَویّے سے اس کا دل بلبلے کی طرح بیٹھ گیا، اُسے یہ بھی احساس تھا کہ مایوسی انسان کے اندر سرد مہری پیدا کر دیتی ہے مگر اس لمحے نا جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر سائرہ

کے اس رویّے کی وجہ پوچھے۔ بغیر کچھ کہے سائرہ نے اُسے راستہ دے دیا اور اپنے اندر کے جوار بھاٹا کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے، وہ خاموشی سے اندر آ گیا۔ پسینے سے بھیگی ہوئی قمیص اُتار کر اُس نے ایک طرف اُچھال دی اور منھ ہاتھ دھونے لگا۔ اس دوران سائرہ تولیہ لئے پاس ہی کھڑی رہی، اُس نے تولیہ لے کر منھ ہاتھ خشک کرتے ہوئے کہا۔

"جو تم سمجھ رہی ہو، وہ صحیح ہے"

اور تولیہ سائرہ کو تھماتے ہوئے کہنے لگا، اُس کے لہجے میں درد نمایاں تھا

"تم اس بار بھی سالگرہ کے فنکشن میں نہ جا پاؤ گی"

سائرہ چپ ہی رہی، بس اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، یہ مسکراہٹ پھیکی تھی۔ سائرہ کی مسکراہٹ کا یہ پھیکا پن اس کے روئیں روئیں میں اُتر گیا۔

"کہیں سے رقم کا بندوبست نہ ہو سکا ورنہ وہاں جانے کے لئے تمہارے واسطے معمولی سی سہی، کوئی ساڑھی لے آتا۔"

"میں نے تمہیں پہلے ہی روکا تھا، اور نہ مجھے تم سے کوئی شکایت ہے"

اُس نے سائرہ کو عدم اعتماد سے دیکھا، ایسے حالات میں بھروسے کی صلاحیت بھی ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔

"تم نے میرے ساتھ رہ کر بہت دکھ جھیلے ہیں" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز رندھنے لگی "اس میں سارا قصور میرا نہیں، تم میرے حالات سے آگاہ تھیں، اس کے باوجود تم نے اپنے آپ کو ان دکھوں میں کیوں دھکیل دیا تھا۔؟"

"ان باتوں کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں" یہ کہہ کر سائرہ وہاں سے اُٹھ گئی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ سارہ کے پاس باورچی خانے ہی میں جا بیٹھا۔ اس وقت وہ برتن مانجھ رہی تھی۔ اس نے سارہ کی برتن مانجھتی ہوئی انگلیوں کو دیکھا، یہ وہی انگلیاں تھیں جنھیں ہاتھوں میں لیے وہ تکا کرتا تو سارہ یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کھینچ لیتی

"کیا رکھا ہے ان انگلیوں میں ۔۔۔"

اور وہ اس بات کا کوئی جواب نہ دے پاتا کیونکہ جو اس کے دل میں ہوتا وہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت سارہ اس کے یوں دیکھنے سے اسی طرح پھر مسکرائی، اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ساری محرومیاں اس مسکراہٹ کے پردے میں چھپ گئی ہوں اسی کیفیت میں اس نے کہا

"پرسوں پہلی تاریخ ہے، اس بار میں تمہارے لیے ایک ساڑھی ضرور لے آؤں گا۔ اب تک تم شادی کے کپڑے ہی پہنتی رہی ہو ۔۔۔"

"اس سے زیادہ ضروری منّی کا یونیفارم ہے جو پھٹ چکا ہے اور تمہارے پاس بھی تو جوتے نہیں رہے۔"

پہلی تاریخ کے الفاظ اس کے تاریک ذہن میں ہمیشہ اُجالے کی کرن بن کر اُبھرتے اور وہ میٹھے میٹھے تصورات میں اُلجھ جاتا۔

دونوں پہلی سے پہلے تنخواہ خرچ کرنے کے پلان بناتے اور جب ایک ہفتے میں سارے روپے خرچ ہو جاتے تو اگلی پہلی کا انتظار شروع ہو جاتا جیسے ان کی زندگی ہی پہلی تاریخ کے انتظار میں گزری جا رہی ہو۔

ابھی دو مہینے پہلے ہی اس کی پچھلی ملازمت چھوٹ گئی تھی کیونکہ اس کے افسر کو اس جیسے خوددار اور ایمان دار ملازم کی ضرورت نہیں تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی

زندگی کے سورج نے گھٹاؤں کا نقاب اوڑھ لیا ہو۔ جب اُس نے سائرہ کو یہ بات بتائی تو اس نے کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ حسبِ عادت اس کی ہمت بندھائی۔ اس کے بعد ملازمت کی تلاش میں ناکام ہو کر گھر واپس ہوتا تو سائرہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کا دھیان بٹا دیتی۔ انہی باتوں سے اس کے دل میں ہر صبح سائرہ کی محبت میں نکھار پیدا ہوتا رہا۔ وہ سوچتا ان تلخ دنوں اور کالی کلوٹی راتوں میں سائرہ کی محبت کے ٹمٹماتے دیئے نہ ہوں تو اس کی زندگی میں کتنا اندھیرا چھا جائے۔ پھر سائرہ کی محبت کی ٹھنڈک میں بھاگ دوڑ کرتے ہوئے اسے ۸۰ روپے ماہوار کی ملازمت دوبارہ مل گئی۔

وہ دن بھر فائلوں کے انبار سے نمٹتا رہتا، اُسے محسوس ہوتا جیسے اس کی باقی زندگی انہی فائلوں کے انبار تلے بسر ہو جائے گی۔ فائلوں کا انبار جتنا اونچا ہوتا چلا جاتا وہ اُتنا ہی اپنے آپ کو کسی گہرائی میں پڑا ہوا پاتا۔ گھر جاتا تو سائرہ اس عرصے میں قرض لے کر گزارہ کرنے کا تذکرہ کرتی لیکن ساتھ ہی ۳۰ دن کے طویل انتظار کے بعد ۸۰ روپے ملنے کے خیال سے اس کے دل میں مسرت کی لہریں اُٹھنے لگتیں۔

صبح سائرہ نے بڑی اُمیدوں سے رخصت کیا، منّی نے ننھے ننھے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور وہ خوشی خوشی راستے بھر اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا۔ دفتر پہنچ کر اس نے بڑی مستعدی سے کام شروع کیا۔ تنخواہ لیتے وقت اس کی عجیب کیفیت تھی، سامنے کھڑے ہوتے اس کے سیکشن کے ایک ساتھی نے کہا —

"میرے روپے یاد رکھنا"

"تمہارے روپے؟"

"بھول گئے —"

"نہ۔ نہیں ۔۔۔ "

"صرف ۵۰ روپے تو ہیں۔ بھئی اس بار مجھے کچھ زیادہ ضرورت ہے"

اس کے روپے دے کر جلدی جلدی دفتر سے نکل کر وہ سڑک پر ہو لیا مگر سڑک عبور کرتے ہوئے کسی کی آواز پر چونک گیا، اس کے سامنے اس کا ایک دوست کھڑا تھا۔

"تم۔ اچھا تم بھی اپنے روپے لے لینا"

لیکن اس کی تیز نظروں سے گھبرا کر وہ کوئی بہانہ نہ کر پایا اور اس کے ۳۵ روپے دے کر چوکنا ہو کر لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا گھر کی جانب جانے لگا۔ بازار سے گزرتے ہوئے دکاندار کی آواز نے اس کے قدم تھام لئے جیسے دکاندار کے پھینکے ہوئے جال میں وہ بے بس ہو کر رہ گیا ہو۔ وہ رحم طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگا مگر شاید دکاندار کچھ سُننے کو تیار نہ تھا۔

"کئی مہینوں سے اُدھار دے رہا ہوں ۔۔ "

دکاندار کے ۱۳۰ روپے چُکا کر اس کے پاس ۵۸۵ روپے بچے۔ اس کا کل سرمایہ! اسی رقم میں سائرہ کے لئے ساڑھی، مُنّی کے لئے یونیفارم اپنے لئے جوتا اور مہینے بھر کا خرچ چلانا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کا دماغ بھنا گیا اور بوجھل قدموں سے گھر میں داخل ہوا تو سائرہ کی منتظر مُسکراہٹ اس کو مضمحل دیکھ کر یک لخت پریشانی میں بدل گئی۔ مگر فوراً ہی اس نے اپنے چہرے پر دوبارہ مُسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ حالانکہ اس کی شخصیت نے سائرہ کے چہرے کی سادگی کو کبھی مصنوعات سے آلودہ نہیں ہونے دیا تھا۔ کچھ دیر جانی بوجھی خاموشی رہی۔ اس خاموشی کو دروازے پر کسی کی دستک نے توڑا۔ مالک مکان پچھلے دو ماہ کا کرایہ مانگنے آیا تھا، اس کے ۵۵۰ روپے ادا کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینے کے

قطرے نمودار ہونے لگے اور پھر بجلی کے پچھلے تین ماہ کے بل کے ساتھ بجلی کاٹنے کے نوٹس کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، اسی عالم میں سارہ نے نہایت دھیمی آواز میں اُسے بتایا۔

"پڑوسن ابھی آئی تھی اپنے ۲۰ روپوں کا تقاضہ کر رہی تھی ۔"

اُس نے یہ روپے دیتے ہوئے زور سے کہا

"لو اب صرف ۱۵ روپے باقی بچے ہیں"

سارہ حسبِ عادت تسلّی دینے کے لئے آگے بڑھی تو اس کے چلاّ کر "دُور ہٹو" کہنے سے سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت سارہ کی ساڑھی، مُنّی کی یونیفارم اور اس کے جوتوں پر غم کی گہری کُہر چھاگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے دل سے دُھواں اُٹھا جو روح پر یورش کرتا ہوا سارہ کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلا۔ اسی لمحے دروازے پر دودھ والا دستک دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا"

اُس نے باقی ۱۵ روپے دروازے کی طرف اُچھال دیئے اور مُنّی کو اپنے بازوؤں میں لے کر اپنا سر سارہ کے کاندھے سے ٹکا کر کہا۔

"میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا، کچھ بھی تو نہیں۔"

———:(٭٭):———

بند لبوں کی چیخ

اپنے وجود کو بوجھل قدموں پر لادے وہ دفتر آیا تو خیالات اُلجھے دھاگوں کی مانند اس کے ذہن میں گڈمڈ تھے۔ آتے ہی اس نے اپنے آپ کو سیٹ پر گرادیا۔ سب کی نظریں اس پر پڑیں، ان نظروں میں طنز کا زہر اس کے جسم میں رفتہ رفتہ سرایت کرنے لگا اور مختلف چہروں پر مسکراہٹیں اسے ننگا کر رہی تھیں۔

"صاحب صبح ہی سے تمہارے لئے بے تاب ہیں!"

پاس بیٹھے ہوئے اس کے ساتھی نے ایک نوکیلا جملہ اس پر اُچھالا جو اس کے ذہن میں جاکر چُبھ گیا۔ اس کی مُسکراہٹ، اس کے لہجے کی تیزی اور آواز کے چبانے سے وہ بلبلا کر رہ گیا۔ اس نے غصّے سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا مگر ہر شخص خود اس کی طرف معنی خیز انداز میں یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس میں نسوانیت پیدا ہوگئی ہو اور وہ نظروں ہی نظروں میں اس کے جسم کو مسل رہے ہوں۔ اس

نے غصّے کو بے چارگی میں لپیٹ کر نگلنے کے بعد کچھ عافیت محسوس کی۔

"جاؤ ان کی بے چینی دُور کرو۔"

اُس نے گھور کر اپنے اُسی ساتھی کو دیکھا تو زوردار قہقہہ سُننا پڑا۔ وہ تلملا کر رہ گیا اور خود پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیر میں آیا ہوں اس لئے پوچھ رہے ہوں گے۔"

"دیر میں تو تم روز ہی آتے ہو، تمہیں کون پوچھتا ہے۔"

"جسے پیا چاہے وُہی سُہاگن۔"

یہ آوازیں طنز کا دھواں بن کر اُبھریں اور یہ دُھواں اس کے مُنہ، ناک اور آنکھوں میں چلا گیا جس سے اس کے اندر کسی کڑواہٹ کا احساس پیدا ہوگیا۔ آوازوں کی اس بوچھاڑ سے گھبرا کر وہ چاروں سمت پھیلی ہوئی آوازوں کے اس بھنور سے نکل جانا چاہتا تھا مگر اس بھنور نے پھیلتے پھیلتے اب اس کے وجود اور اس کے پورے ماحول کو گھیرے میں لے لیا تھا اسے ان جملوں اور قہقہوں کا روز ہی مقابلہ کرنا پڑتا تھا اس لئے وہ اب ان تمام باتوں کا عادی ہوچکا تھا۔ شروع شروع میں اس نے انجان بنے رہنے کی کوشش کی اس کے بعد اس نے لوگوں کے ذہن سے شبہات نکالنے چاہے مگر کسی کا رُویّہ نہ بدلا، روز بروز ان میں شدّت پیدا ہوتی رہی۔ پھر وہ سب کی سُنتا جواب نہ دیتا۔

اس وقت جان بوجھ کر وہ ایک فائل پر جُھک گیا اور اس کا دل روز کی طرح کام سے اُچاٹ تھا۔ بظاہر آنکھیں جھکی ہوئی تھیں مگر ذہن سب لوگوں کے چہروں کو پڑھ رہا تھا۔ اُسے ہر لمحے یہی خوف رہتا کہ کسی طرف سے کوئی جملہ کرکٹ کی گیند کی طرح اُچھل کر آئے گا، اس کے ذہن پر چوٹ مارے گا اور جسم کی گہرائیوں میں گر کر روح کو مجروح کردے گا۔ ایسی کیفیت میں کوئی

بھی قہقہہ کہیں سے سُنائی دیتا تو وہ گھبرا کر اُدھر دیکھتا اور فوراً نظریں نیچی کر لیتا۔ اس کے ساتھی کہیں بات کر رہے ہوتے تو وہاں سے کٹ کر نکل آتا۔ اُسے یہی لگتا جیسے وہ اُسی کی چغلی کھا رہے ہوں۔

"تو بھئی پھر بلاوا آیا ہے۔"

اُس نے گھبرا کر نظریں اوپر اُٹھائیں۔ اس کے سامنے چپراسی کھڑا معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ اس کی مُسکراہٹ اُس کے چہرے سے نوچ ڈالے مگر اِدھر اُدھر سے اُبھرنے والے ہلکے ہلکے قہقہے اس کے جسم کے احاطے میں اُچھل اُچھل کر اس کے جسم کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ اس وقت اُٹھ کر وہ کہیں جانا نہیں چاہتا تھا اس لئے اُس نے دوسرا فائل اُٹھایا اور اُسے اپنی ذہنی اور اعصابی کیفیت کی طرف سے دھیان ہٹانے کی غرض سے دیکھنے لگا اور بلاوجہ کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ چند لمحے کے بعد اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ نظر اِدھر اُدھر دوڑائی اور گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا تاکہ چپراسی کے دوبارہ آنے سے پہلے ہی وہاں سے اُٹھ جائے۔

ڈائرکٹر صاحب کے چپراسی کو حکم تھا کہ ایسے موقع پر دروازے پر موجود رہے اور کسی کو کمرے میں داخل نہ ہونے دے۔ کچھ دیر کے بعد وہ صاحب کے کمرے سے باہر نکلا تو اس کی نفسیاتی اور اعصابی کیفیت میں اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے کمرے کی بجائے وہ تیزی سے باہر کینٹین کی طرف چلا گیا۔

ڈائرکٹر صاحب کے پاس وہ برف کی مانند ٹھنڈا رہتا حالانکہ اُنھوں نے جذباتی انداز میں اس کے عہدے میں ترقی کا حکم بھی سُنایا تھا مگر اس کی خوشی، اس کی ذہنی کشمکش میں کہیں دب کر رہ گئی۔ اس کی پوری شخصیت اس دفتر کے ماحول میں ختم ہو کر رہ گئی تھی اور کسی انجانے خوف و اذیت کے درمیان پستی جا رہی تھی۔ حالات مختلف ہوتے تو وہ اپنی اتنی جلد ترقی پر پاگل ہو

جاتا کمرے سے چھلانگیں مارتا ہوا باہر نکلتا اور ایک ایک کو خوشخبری سُناتا۔ اب یہ خوش خبری اس کے تہہ بہ تہہ احساسات کی مٹی میں کہیں رُل مِل گئی تھی۔ یہاں دفتر میں وہ یہ خوش خبری کسی کو سُنا بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خوشی کا یہ جذبہ گندگی کے کسی ڈھیر پر سہما ہوا بیٹھا ہو۔

اس کی یہ ملازمت اس کی، اس کے بہن بھائیوں کی اور اس کی ماں کی زندگیوں کے لئے بیحد اہم تھی اور بڑی مشکل سے اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ملی تھی۔ ملازمت ملتے ہی اپنے طبقے کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کے تصوّر نے بھی شیشے کا گھر تراش لیا تھا۔ اس دفتر کے ڈائرکٹر صاحب نے اُسے ایک ہی نظر میں بھانپ کر اس کڑے زمانے میں بغیر کسی سفارش کے رکھ لیا تھا۔ وہ ان کی شرافت اور رحمدلی کا دل سے قائل ہوگیا پھر رفتہ رفتہ اس کے یہ خیالات بدلتے گئے۔ اس کے اور ڈائرکٹر ایسے اعلیٰ افسر کے درمیان جو کلچر اور اخلاق کی رسّی تھی وہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگی اور ان کے لئے اس کے دل میں نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ اس نے سختی سے بات کرنی چاہی مگر دوسرے شہر میں تبادلے کی دھمکی اس کے لبوں پر چُپ کا پہرہ لگا دیتی۔ اس کے باوجود اس نے احتجاج کیا تو اُسے ملازمت سے علیحدگی کی دھمکی دی گئی اور وہ سہم کر رہ گیا۔ ذہن و جذبات کی کشمکش سے اُسے نجات کسی صورت نہیں مل رہی تھی۔ اُسے اپنی ماں اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال آتا تو وہ کانپ کر رہ جاتا اور زندگی کی یہ مجبوریاں اس کے ہونٹوں پر شرافت کا ہاتھ رکھ دیتیں۔ ارادے کی دھوپ اب منتشر خیالات کی کہر میں ڈوب گئی تھی۔ شیشے کا گھر حالات کے پتھروں سے چکنا چور ہو جانے کے خیال سے وہ لرز اُٹھا۔ پچھلے لمحات اور واقعات پچھاوے بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے جنھوں نے نشتر بن کر اس کی زندگی میں جنم لے لیا تھا وہ ان سے اب دامن نہیں بچا سکتا تھا اور نہ آنکھیں ملا سکتا تھا

کینٹین سے واپس آیا تو صاحب کی لیڈی سکریٹری اُسے دیکھتے ہی اُس کی طرف لپکی اُسے مبارکباد دی اور اُسے ترقّی کا آرڈر تھما دیا۔ وہ مُسکرا مُسکرا کر طنزیہ انداز میں اُسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے بھی ابھی تک ترقّی نہیں ملی اور آپ کو......"

وہ ایک عجیب معنی خیز نظر اس کی طرف پھینکتی ہوئی مُسکرائی اس میں آگے سُننے کی تاب نہ تھی اور وہاں ٹھہرنا اس کے لئے دشوار ہو رہا تھا۔

"آپ میں ایسی کون سی بات ہے جو مجھ میں نہیں ــــــ"

وہ اس بات پر تلملا اُٹھا۔ اس پر برابر کھڑے چپراسی نے کچھ کہنا چاہا تو اس کا جی چاہا کہ اس کا گلا دبا دے۔ چپراسی اس کی غصیلی نگاہوں کی وجہ سے مصلحتاً چُپ ہو گیا۔ کیونکہ دفتر میں لوگ اپنے کام نکلوانے کی بنا پر اس سے ڈرتے تھے اس کے باوجود وہ خود اندر ہی اندر ان سب سے ڈرا ڈرا رہتا اور اسے اندر ہی اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی وہ شعوری اور لاشعوری دونوں طور پر ہمیشہ اُداس رہتا۔ اس وقت اس سے وہاں زیادہ نہ ٹھہرا گیا۔ لڑکی کا قہقہہ اس کا پیچھا کرتا رہا اور ذرا سی دیر میں یہ بات پورے دفتر میں پھیل گئی۔ اُچھلتی ہوئی باتوں کے پتّھر اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے اور اس کے ذہن و روح کو لہولہان کر رہے تھے۔ کچھ لوگ اس کے گرد گھیرا ڈال کر پہلے سے زیادہ نوکیلے جملے اس کے جسم میں چبھونے لگے دو ایک نے احتجاج بھی کیا اس کے جسم کے اندر شیشے کی کرچیاں بکھر گئی تھیں۔ رگ رگ میں چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ بات ڈائرکٹر تک پہنچی تو انھوں نے ایک آدھ کو بُلا کر ڈانٹ پلائی اور کسی کو دھمکی دی تو بات دب گئی۔ کیونکہ وقت کے بے کراں سمندر میں خطرات غائب ہو ہی جاتے ہیں۔

ایک روز جب اس نے سُنا کہ ڈائرکٹر صاحب کا تبادلہ کسی دوسرے شہر ہو گیا ہے تو اس کے جسم میں خوشیوں کی لہریں پیدا ہونے لگیں۔ کئی جگہ فون کر کے یقین کر لینے کے بعد وہ پھولا نہیں

سمارہا تھا۔ اسی خوشی کے نشے میں وہ خود پہلی بار اپنی مرضی سے صاحب کے کمرے میں جا پہنچا۔ ان کے چہرے پر جانی پوجھی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے وہ سوچ رہا تھا کہ افسوس کا اظہار کرے گا۔ کرسی پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ انھوں نے بتایا۔

"میں نے ساتھ ہی تمہارا تبادلہ بھی کرا لیا ہے۔"

یکبارگی اس کے ذہن میں دھماکہ سا ہوا۔ ان کا یہ جملہ اس کے ذہن کی دیواروں سے بار بار ٹکرانے لگا اور اس طرح ٹکرانے سے جو گونج پیدا ہو رہی تھی وہ اس کے خون کے ساتھ اس کی نس نس میں تیرنے لگی۔ اس کے اعضا جواب دینے لگے اور آنکھیں پتھرانے لگیں۔ وہ کچھ کہنے کی اپنے اندر ہمت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سامنے وہی دھمکیاں تھیں اور ان دھمکیوں کے ساتھ ہی اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے چہرے اس کے سامنے آ گئے۔ اس وقت مجبوری کی ہڈی اس کے حلق میں اٹک گئی اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اعضا ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں مگر اپنی اس ذاتی کیفیت میں فطری طور پر اپنے بہن بھائیوں اور ماں کو چھوڑنے کا ملال بھی اس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اس وقت اپنا شہر، اس کے لوگ اور اس کا سارا ماحول اسے اجنبی لگا اور اس بھرے ماحول میں بھی اپنے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ اس کا وجود اندر سے نکل کر احتجاجاً باہر جا کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ ہر معاملے میں اپنے کو مجبور و بے بس محسوس کر رہا تھا اور نفسیاتی طور سے وہ اپنے کو کمزور اور کسی احتجاج کے قابل بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کا دل چھوٹا تھا اور دکھ زیادہ اپنی شعوری اور لاشعوری دونوں مجبوریوں کو ساتھ لیے وہ ان کے ساتھ دوسرے شہر آ گیا۔

یہاں دفتر کی طرف سے ڈائرکٹر صاحب کو ایک بڑا بنگلہ ملا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ ان کے خاندان کے ساتھ ایک کمرے میں رہے۔ ان کا مشورہ اصل میں حکم ہوتا تھا جس سے سرتابی اس کے بس میں نہ ہوتی اور یہاں تو ویسے بھی اس مشورے پر عمل کرنے کے لیے مجبور تھا کہ اس نئے شہر میں

علیحدہ مکان ملنا دشوار تھا۔ ڈائرکٹر صاحب کو اب آزادی اور آسانی میسّر آگئی تھی۔

پھر اچانک صاحب کا ہفتہ بھر کے لئے سرکاری دورہ نکل آیا تو نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی اور کمی کا احساس اس کے ذہن پر چپک کر رہ گیا۔ وہ خالی خالی سا رہ گیا اور صحرا کے ریت کے بگولے کی مانند اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔

ایک روز سوتے سوتے ہڑبڑا کر لاشعوری طور پر کسی بے چینی کی بنا پر اس کی آنکھ کھلی تو وہ غیر ارادی طور سے اُٹھا اور ڈائرکٹر صاحب کے کمرے کی جانب عادی قدموں کے ساتھ چل پڑا۔ اس عمل میں اس کی ایک جانی بوجھی دبی ہوئی عادت شامل تھی۔ ان کا کمرہ خالی دیکھ کر معاً اُسے یاد آیا کہ وہ تو دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ اس خیال سے اس کی دبی ہوئی عادت نے اس کی بے چینی میں یکبارگی شدت پیدا کر دی اور اس میں جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی اور شاید اسی کیفیت کی وجہ سے اس کے شعور میں کئی روز سے بیٹھے ہوئے ایک ارادے نے سر اُبھارا۔ وہ دبے قدموں کے ساتھ ان کی بیٹی کے کمرے کی جانب چل دیا جو کئی بار نظروں نظروں میں اس سے بہت کچھ کہہ چکی تھی مگر صاحب کے خوف کی وجہ سے وہ ہمیشہ نظر انداز کرتا چلا آیا تھا۔ اُس نے کھڑکی کے ذرا سے سرکے ہوئے پردے میں سے جھانکا وہ ابھی تک بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے بدن میں وہی بیج ڈال دے گا جو ڈائرکٹر صاحب اس کے بدن میں اُنڈیلتے رہے تھے۔ تاکہ وہ اپنے بوئے ہوئے بیج کو پھل بنتا ہوا خود بھی دیکھ لیں۔ اس عمل میں شعوری طور سے اِنتقام کا جذبہ کارفرما تھا۔ آہٹ پا کر لڑکی نے اس کی طرف دیکھا، اس کی نظریں حیرت اور خوف کی جگہ استقبالیہ جذبات کی عکاسی کر رہی تھیں۔ غیر متوقع خواہش اچانک پوری ہونے کی اُمید اس کے چہرے پر اُبھر آئی اور سپردگی کی مُسکراہٹ کے ساتھ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اُس نے دیکھا وہ کوئی جنسی ناول تھی۔ لڑکی نے بھی اس کے کسی عمل پر احتجاج نہیں کیا۔ جیسے وہ

خود ڈائرکٹر صاحب کے کسی حکم پر احتجاج نہ کر پاتا تھا۔

اُس نے اچانک اندرونی طور پر محسوس کیا کہ وہ اس لڑکی سے کبھی اِس وقت انہی حرکات کی اُمید رکھے ہوتے ہے جو ڈائرکٹر صاحب اس کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ اس وارفتگی کے قابل نہیں رہا جو عورت مَرد سے چاہتی ہے۔ یکایک اس کے جسم میں اوپر سے نیچے تک سنسنی پیدا ہونے لگی اور ذہن میں گہرا سنّاٹا چھا گیا ——!!

——×:(※):×——

پھانس

جب رات کی سیاہی صبح کی دلفریب روشنی میں بدلنے لگتی، گاؤں کے کچے پکے مکانوں کے نقوش دھندلاہٹ سے واضح ہوتے چلے جاتے اور دھان کے لانبے لانبے نازک پودے صبح کی سرد ہوا سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتے تو وہ اس وقت اپنی کچی کوٹھری میں ایک طویل انگڑائی لے کر اٹھتا۔ ایک نظر اپنی شانو پر ڈالتا جو صبح کی نرم اور دھندلی روشنی میں گہری نیند سوئی ہوتی۔ ایک لمحے اُسے جگانے کے بارے میں سوچتا لیکن وہ اس کی میٹھی نیند میں خلل نہ ڈالنا چاہتا اور اس لئے اس خیال سے باز رہتا۔ دھوتی کاندھے پر ڈال کر وہ باہر نکل آتا اور مٹی کے لوٹے سے ٹھنڈا باسی پانی لے کر دو ایک چھپکے مارتا، رات کی باسی روٹی کھا کر اپنے ٹھیلے پر رات میں چنی ہوئی ترکاریاں ترتیب سے سجاتا اور شہر جانے والی سڑک پر ہو لیتا۔

گاؤں کی چوپال میں بیٹھ کر دن بھر شہر میں جو دیکھتا وہ بیان کرتا اور رات گئے گھر

لوٹتا۔ صبح جب وہ ٹھیلا لے کر شہر کی طرف جارہا ہوتا تو اُسے بار بار یوں محسوس ہوتا گویا ٹھیلے کے زنگ آلود پہیّوں سے اُٹھنے والی چرخ چوں میں لوری کی سی کیفیت ہو۔ وہ ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے بے خبر ہو جاتا اور اس کے قدم خود بخود ہی بڑھتے۔ پھر کسی چھوٹے سے گڑھے یا پتھر پر پاؤں پڑ جانے سے اس کو ایک دھچکا لگتا تو اُس کو اپنا دل اُچھلتا محسوس ہوتا۔ وہ چونک کر آنکھیں کھولتا اور پھر اس کیفیت سے نکلنے کے بعد وہ ہوشیار ہو کر آگے بڑھتا۔

شہر کو جانے والی سڑک صبح کے وقت بڑی مصروف رہتی اور دودھ والوں کی سائیکلوں مچھلیوں کے ٹرکوں، باہر سے لکڑیاں لانے والے ٹرکوں، گاڑیوں، ٹھیلوں، سائیکلوں کی وجہ سے ہر آن، ہر لمحے، ذرا سی غفلت سے حادثہ ہونا کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ اُس کو اس وقت مرنا پسند نہ تھا کہ اس کی شانو تو گھر پر اس کا انتظار کر رہی ہو اور وہ خود سڑک پر سرخ سرخ خون سے نہایا پڑا ہو۔

جب کوئی ٹرک سڑک چھوڑ کر کچے میں آجاتا اور دھول اڑاتا اس کے پاس سے گزر جاتا تو وہ، اس کا ٹھیلا اور اس پر رکھی ہوئی ترکاریاں دھول سے اَٹ جاتیں۔ وہ دھول کے اس ہیولے سے نکل کر ٹھیلے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی مٹکی سے پانی چلّو میں لیتا اور سبزیوں پر چھڑک کر ان کی تازگی اور نکھار کو زندہ کرتا۔ برسات کے دنوں میں تو وہ بہت احتیاط سے چلتا اس لئے کہ ان دنوں میں ٹرک والے اس کے قریب سے اس طرح تیزی سے ٹرک نکال لے جاتے کہ گڑھے میں جمع شدہ پانی کی چھینٹیں اس کے کپڑوں اور ترکاریوں پر گلکاری کر دیتیں۔ یوں وہ شہر کی چوڑی اور مصروف سڑک پر آ نکلتا۔ جہاں اس وقت کالج اور اسکول کے لڑکے اور لڑکیاں گنگناتے، باتیں کرتے، ہنسی مذاق کرتے سڑک پر چلتے نظر آتے۔ ان جوان لڑکیوں کو دیکھ

کر جو اپنے جوان سینے سے موٹی موٹی کتابیں، کاپیاں لگائے آپس میں ہنسی مذاق اور باتیں کرتی چلتیں اس کو ہمیشہ اپنی شانو اتنی شدت سے یاد آتی کہ ایک لمحے وہ خود کو بھول کر ان لڑکیوں کے لباس میں اپنی شانو کو دیکھتا۔ اور کچھ دیر بعد جب اسے اچانک اپنے وجود کا احساس ہوتا تو غربت کے احساس سے اس کے منھ سے گہری آہ نکل جاتی، دوسرے لمحے یہ سوچ کر شانو اگر ایسی لڑکی بن گئی تو شاید اس کی بن رہے اسے کچھ اطمینان ہوتا۔ غربت میں حقیقت سے فرار انسان کو بہت سکون بخشتا ہے لیکن اس کے باوجود اس خیال کو دل سے نکال پاتا کہ کاش شانو کے پاس بھی ایسے ہی عمدہ عمدہ لباس ہوتے اور چوں کہ اس کے پاس یہ سب کچھ نہ تھا اور نہ اُمید کی کوئی کرن ہی غربت کے اندھیرے میں نظر آتی اس لئے وہ رفتہ رفتہ شہر کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگا۔ یہ جذبہ اس میں دن بدن قوی تر ہوتا گیا۔

دن بھر وہ دُھوپ میں کھڑا رہتا اور سوچتا کہ جب وہ شام گئے گھر لوٹے گا تو شانو اس کو دیکھ کر کھلکھلا اُٹھے گی، اُس کی تمام دن کی تھکاوٹ دُور ہو جائے گی اور اس کا دن بھر کی دُھوپ میں جُھلسا ہُوا بدن شانو کی قربت کی ٹھنڈک میں طمانیت حاصل کرے گا۔ ایک دوسرے کے قرب سے ان دونوں کے دلوں میں ہمیشہ ہرے بھرے کھیتوں کی سی خوشبو بس جاتی جو روُح تک کو تازہ کر دیتی ہے اس کی زندگی میں شانو کے قرب سے رسیلے پھلوں کے تازہ شگوفوں اور مہکتے پھولوں کی کچی کلیوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

جب سورج کی الوداعی کرنیں کانپتے کانپتے دم توڑنے لگیں، زمین پر شام اُتر آئی اور وہ گھر واپس پہنچا تو شانو نے ایک نئی بات اس سے کہی۔

"راجو مجھے بھی شہر دکھا دے نا ـــــ"

اس نئے اور اچانک سوال پر اس نے شانو کو غور سے دیکھا پر خاموش ہی رہا تو شانو

اسے جھنجھوڑ کر کہنے لگی۔

"آج شہر سے ایک لڑکی آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ شہر میں ایسی ایسی چیزیں ہوتی ہیں کہ بس دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔" اُسے یوں محسوس ہوا جیسے فضا کی ساری تپش اس کے دل میں اُترتی جا رہی ہو اور روئیں روئیں میں اُس کا احساس جلنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے اندر سے نکلنے والے الفاظ پگھل پگھل کر فضا میں تحلیل ہونے لگے۔

شانو کے یہ الفاظ اس کے ذہن کی کسی انجانی سطح پر اب جم کر رہ گئے تھے۔ یہی سوچتے ہوئے جب اگلے روز وہ تھکا ماندہ اپنے ٹھیلے کو لئے عدم اعتماد سے قدم رکھتا گھر کے صحن میں پہنچا تو خلافِ معمول شانو اُس کے ٹھیلے کے پاس نہیں آئی۔ ایک لمحے کے لئے اُسے اپنے اِرد گرد سناٹا سا محسوس ہوا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو یکجا کیا تو شانو کی آواز کان کے پردے پر کنکریوں کی طرح گری۔ شانو کسی سے کہہ رہی تھی۔

"ہم کسی کا احسان نہیں لیتے۔ تم پیسوں کے بدلے اناج لے لو۔" اس پر کسی دوسری لڑکی کی ہلکی سی ہنسی آئی۔

"تم ویسے ہی لے لو، کیا میں تمہاری سہیلی نہیں —؟"

"نہیں — ویسے ہی نہیں لوں گی۔ راجو کو آنے دو پیسے اُسی کے پاس ہوتے ہیں۔ بس آتا ہی ہو گا۔"

"یہ راجو کون ہے؟" اس لڑکی نے پوچھا۔

"راجو —" شانو کی آواز سے حیا صاف ٹپک رہی تھی۔ "راجو، راجو ہے۔"

راجو شانو کی اس بات پر خود بھی مسکرایا۔ مگر نہ جانے کیوں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ اس کی اپنی مسکراہٹ نہ ہو کسی اور کی مسکراہٹ اپنے چہرے پر مڑھ لی ہو۔

"لوراجو آ گیا۔" شانو کے کہنے پر اس لڑکی نے بھی جھانکا۔

"یہ تو مرد ہے مرد!" شہری لڑکی کے منھ سے اس طرح آواز نکلی جیسے اس کے منھ میں کوئی ذائقہ دار چیز گھل گئی ہو۔ راجو یہ سن کر جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

"کیا شہر میں مرد نہیں ہوتے؟" شانو نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بھولپن تھا۔ اس پر شہری لڑکی کا ہلکا سا قہقہہ ابھرا۔

"ہوتے تو ہیں، مگر سڑے سڑے سے۔" اس لڑکی کے اس جملے کے پس منظر میں پوری شہری معاشرت اور وہاں کا ماحول چھپا بیٹھا تھا۔

اس لڑکی کے جاتے ہی شانو اس کے پاس دوڑی دوڑی آئی۔ اس نے دیکھا شانو کے ہونٹوں پر لالی لگی ہوئی تھی اور اسے متجسس اور پر اشتیاق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تجھے اس کی ضرورت نہیں شانو۔"

شانو راجو کے لہجے کی بے رخی اور ناپسندیدگی فوراً بھانپ گئی۔

"اتنی اچھی تو لگتی ہے" شانو نے شیشے کے ایک ٹکڑے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تجھے کیا پتہ شہر کی تمام لڑکیاں لگاتی ہیں۔"

اس وقت شانو نے اس کے سامنے شہر دیکھنے کی پھر ضد کی تو اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھ لینا شہر بھی مگر تو خوش نہ ہوگی ـــ وہاں بناوٹ اور ملاوٹ کے علاوہ کیا دھرا ہے۔ خالص پانی بھی نہیں ملتا اور انسان تو خالص ہوتا ہی نہیں ـــ" یہ کہہ کر وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کی خاموشی میں اداسی کا عنصر بھی شامل تھا۔ چوپال میں بھی چپ چپ ہی رہا۔ سب نے وجہ پوچھی، وہ ٹال گیا۔ بتاتا بھی تو کیا بتاتا۔

جب شہر سے اگلی شام وہ ٹھیلا لے کر واپسی کی سڑک پر آیا تو اس وقت بھی اُسے کبھی شانو کی خواہش اور کبھی اس کی شہری سہیلی کا خیال آجاتا لیکن آج اس تصور کے ساتھ نہ معلوم کیوں غصّہ بھی آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہر کی حدود سے نکل کر جلدی سے گاؤں پہنچ جائے تاکہ اسے سکون نصیب ہو۔ اسے مٹی کی کچی دیواروں اور چھپر کی چھت والی اپنی جھونپڑی کے سامنے شہر کی اونچی اور خوشنما عمارتیں ہیچ دکھائی دیں، جہاں اس کے ہر جذبے سے اس کی جھونپڑی کا چراغ جلتا ہے۔ وہ شہر سے گزرتے ہوئے ان عمارتوں کو دیکھنے لگا اور جب اُسے خیال آیا کہ ان کے رہنے والوں میں خلوص نام کو نہیں تو وہ ان مکینوں پر ترس کھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ سوچنے لگا اس کی جھونپڑی میں کم از کم خلوص اور اپنائیت کی خوشبو تو بسی ہوئی ہے اس میں رہنے والی شانو کا خیال آتے ہی اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ یکایک وہ موٹر کے ہارن سے چونک پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خیالات یوں بکھر گئے جیسے ہار ٹوٹ جانے سے موتی بکھر جائیں۔

ابھی وہ کچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ ہی اس کا ٹھیلا اُلٹ گیا وہ خود بھی کوشش کے باوجود سنبھل نہ سکا۔ اُٹھ کر پہلے اس نے ٹھیلے کو سیدھا کیا پھر زمین پر بکھری ہوئی نہ بکنے والی ترکاریوں کو رکھا اور ان کی مٹی صاف کئے بغیر اُسی تیزی سے چل دیا۔

خون کی مہین سی لکیر اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ اسی حالت میں وہ گھر پہنچا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ شانو کی بے ساختہ استقبالیہ مسکراہٹ اس کے چہرے کو خون آلود دیکھ کر زخمی ہو گئی۔

"کیا ہوا۔۔ راجو کیا ہوا۔۔؟"

"میرے چہرے پر جو خون کی لکیر دیکھ رہی ہے یہی وہ سڑک ہے جو شہر جاتی ہے۔ شہر تو خون کا ایک بڑا سمندر ہے۔۔"

بند لبوں کی چیخ

"تجھے کیا ہو گیا ہے؟" شانو کچھ نہ سمجھی اور سسکنے لگی۔

اس وقت اس کے رگ وپے میں طمانیت رچی ہوئی تھی کیوں کہ آج شانو نے نہ شہر جانے کو کہا نہ اپنی شہری سہیلی کا تذکرہ کیا۔ وہ چبھن جو شہر سے گھر واپس آتے ہوئے اس کے دل میں محسوس ہوتی تھی اس وقت غائب ہو گئی تھی۔ اس کے اندر کی اس تبدیلی کو شانو نے اس کے چہرے سے پہچان لیا۔

"آج تجھے ایک چیز دکھاؤں" شانو یہ کہہ کر کوٹھری میں گئی اور فوراً ایک ہار ہاتھ میں لئے واپس آگئی۔ ہار جو کھٹ سے لٹکی ہوئی لالٹین کی پیلی، زرد اور اداس روشنی میں جھلملا رہا تھا۔

"اچھا ہے نا — میری شہری سہیلی آج پھر آئی تھی —"

شانو کے منھ سے یہ الفاظ سنتے ہی مسلسل خود فریبی کا جوالا مکھی آج ابل پڑا۔ اس کی آنکھوں میں شدید غصّے کا احساس جھنجھلاہٹ سے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سی ڈراؤنی کیفیت پیدا کرنے لگا۔ اس نے اچانک ہار ایک طرف پھینک دیا جیسے یہ ہار نہ ہو بچھو ہو جس کا زہر اس کی اور شانو کی زندگیوں میں پھیل جائے گا۔ راجو کی اس یکایک تبدیلی پر اس کے گالوں پر پھر آنسو ڈھلک آئے اور دھیمی آواز میں بولی۔

"یہ ہار پہن کر میں تجھے اچھی نہیں لگی تو اسے پھیر دوں گی" اس کے لہجے میں مایوسی چھپی ہوئی تھی۔

"گہنے پہننا تو عورت کی فطرت ہے" شانو کہیں غار میں سے بول رہی تھی "مجھے اچھا لگا تو میں نے لے لیا —"

خواہش کے باوجود، اپنی بے بسی اور شانو کی فطری کمزوری کو بیک وقت

محسوس کر کے راجو کے دل سے گرم گرم ہوا کی لہر اُٹھی جو اس کے جسم پر چھالے ڈالتی ہوئی گزر گئی۔ وہ شانو کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اسی لمحے خوشگوار ہوا کا جھونکا آیا تو اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن و دل میں جو شہر کے خلاف غبار تھا وہ اب اُڑ گیا ہو اور شانو کے چہرے پر کھلنے والی مُسکراہٹ کی وجہ سے راجو کے دل سے چھن سے آواز آئی جس طرح گرم لوہے پر پانی کے چھینٹے ڈالنے سے آتی ہے۔!!

———— ⁂ ————

بدلتے لمحوں کے دکھ

زندگی کے اتھاہ سمندر کی سطح پر وہ سوکھے پتّے کی طرح ڈول رہا تھا۔ زندگی کا پھیلاؤ عظیم ہوتا ہے اس لئے وہ اس کے پھیلاؤ کے بھنور سے بچنا چاہتا تھا مگر جو وقت اس کے تصرف میں آچکا تھا اب اس سے حساب طلب کر رہا تھا۔ اپنے وجود کو اپنے ہی جسم کے احاطے میں محصور کئے اور اپنے آپ کو اپنے پاؤں پر اُٹھائے چلتے ہوئے اسے یکایک ایک جھٹکا سا لگا اور وہ لاپرواہی سے اُچھالی ہوئی ردی کاغذ کی گولی کی طرح دُور جا پڑا۔

اُس نے محسوس کیا جیسے وہ کوڑا کرکٹ ہو اور کوڑے کے ڈھیر میں پڑا ہو۔ اُس نے اُٹھنا چاہا مگر ماتھے سے خون کی بوندیں آنکھوں اور ناک تک آگئیں۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک خوش لباس آدمی نے کار سے اُتر کر اسے سہارا دیا۔

جیسے ردّی کاغذ پھینکنے والے کو احساس ہو جائے کہ کہیں کام کا کاغذ تو نہیں پھینک دیا اس لئے دوبارہ اُسے اُٹھا کر دیکھے اور بیکار ہی نکلنے پر پھر ایک طرف ڈال دے جیب سے پانچ کا نوٹ اُسے تھماتے ہوئے بولا۔

"یہ لو مرہم پٹی کرا لینا —"

اُس نے غصّے سے ہتھیلی پر رکھے ہوئے نوٹ کو دیکھا جیسے یہ غربت کا سانپ ہو جس کا زہر اس کے بچوں کی اور اس کی بیوی کی زندگیوں میں پہلے ہی پھیل چکا تھا۔ غربت کا احساس ذہن و دل دونوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر جائے، اس کی ٹائی پکڑ کر جھٹکا دے اور یہ نوٹ اس کے منھ پر دے مارے۔

اپنے خون کی یہ ارزانی دیکھ کر اس نے خود ہی جھرجھری سی لی۔ اس وقت اس کی حیثیت غیر حقیقی کردار کی سی تھی جس کی وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ وہ لپکا مگر کار دھواں چھوڑتی آگے بڑھ گئی۔ یہ دھواں اس کی ناک اور آنکھوں میں جا گھسا۔ شاید اسی دھوئیں نے اس کی قسمت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اُس نے سوچا کہ موٹر کے دھکے سے جہاں وہ جا گرا تھا شاید اس کی جگہ وہی ہے اسے وہاں سے اُٹھنا نہیں چاہیئے تھا۔ اسے وہیں پڑے پڑے کلبلاتے رہنا چاہیئے۔ نزدیک ہی ڈسپنسری میں جا کر پٹی بندھوانے کے لئے اس نے سوچا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا دھیان اپنے گھر کی جانب چلا گیا جہاں کئی دن سے ایسے کسی نوٹ کی شکل کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ اس نوٹ کو بچا لینے کے لئے سوچ کر اسے اپنی چوٹ کا احساس چند لمحے کے لئے جاتا رہا۔ صبح سے اس کے، اس کے بچوں، اس کی بیوی کے منھ میں کوئی کھیل تک اُڑ کر نہیں گئی تھی۔ کل بھی تب سے روٹی کے چند نوالے لے کر اوپر سے پانی پی لیا تھا اور

پانی ہی سے اپنی بھوک کے احساس کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ آج اُسے ایک ٹھیکیدار نے مزدوری پر لگانے کے لئے بلایا تھا۔ وہ اپنے آپ کو تصور ہی تصور میں مزدوری پر لگا ہوا دیکھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے سامنے بیوی بچوں کے کھلکھلاتے چہرے آگئے تھے کہ راستہ چلتے ہوئے دفعتاً جھٹکے کے ساتھ اس کے یہ سارے دل خوش کُن تصورات خون میں نہا گئے۔

اب وہ جلدی جلدی گھر کی جانب چل دیا۔ خوشخبری کے منتظر بیوی بچے اس کا خون آلود چہرہ دیکھ کر سہم گئے۔ بیوی شاید یہ پوچھنا بھی بھول گئی کہ مزدوری ملی یا نہیں۔ اس کے چہرے پر بہتے ہوئے خون کے بارے میں اس نے کئی سوال کر ڈالے۔ پہلے وہ چپ رہا۔ اسے اپنی بیوی بچے ردّی کاغذ کی گولیوں کی مانند لگے۔ پھر شکست خوردہ انسان کی طرح زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

"گھبراؤ مت معمولی خراش ہے۔"

اس کا وجود ماضی اور مستقبل کے سروں کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ زندگی میں اس طرح معلق رہنا اس کے لئے مسلسل اذیت کا باعث تھا۔

"یہ پانچ روپے لو اور بچوں کے لئے کھانے کا انتظام کرو۔"

اس وقت وہ بیوی بچوں کی خوشی کے جذبات کو بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ بچے بھی نوٹ کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے اور اس کی بیوی میں اب پھرتی آگئی تھی اس نے اس کے چہرے سے خون صاف کیا اور گھریلو قسم کی دوا لگا کے بعد پٹی باندھ دی۔

یہاں سے فارغ ہو کر اُمید و یاس کے عمیق سمندر میں غوطے کھاتا اور کشمکش کی اتھاہ گہرائیوں میں ٹمٹماتی کرن کی اُمید میں گھٹا ٹوپ اندھیروں میں سے گزرتا وہ ٹھیکیدار کے ہاں

جا پہنچا۔ اس کے دل میں خواہشات کے بجھے ہوئے کوئلے اس لمحے پھر سلگ پڑے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی ٹھیکیدار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تمہیں دیر ہو گئی۔ میں نے دوسرا آدمی رکھ لیا۔ میں کام کا حرج تو نہیں کر سکتا تھا۔"

وہ اُسے اپنے چہرے پر بندھی ہوئی پٹی کی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا لیکن اتنی دیر میں ٹھیکیدار دوسری طرف مصروف ہو چکا تھا۔ اس کے سارے خواب آنسو بن کر بہہ نکلے اس لمحے اُسے یوں لگا جیسے وہ اپنی تاریک زندگی کے کنارے پر کھڑا اپنی خوشیوں کی گم گشتہ کشتی کو تلاش کرنا چاہتا ہو۔ وہ اپنے وجود کو اپنے قدموں پر لادے واپس چلا آیا، ایک ایسے مسافر کی طرح جسے خود اپنی منزل کا پتہ نہ ہو۔ راہیں انجانی ہوں اور مسافر تنہا ہو۔

اس کی ساری زندگی روپے کے پیچھے بھاگتے ہوئے گزری چلی جا رہی تھی۔ اب اس کا سانس پھول گیا تھا اور پاؤں جواب دینے لگے تھے۔ اُسے دو دن مزدوری نہ ملتی تو نوبت فاقوں تک آ جاتی۔ اور وہ تصورات جن میں ہر انسان مبتلا رہنا چاہتا ہے خوش فہمی بن کر بکھر جاتے کیونکہ انسان کو بھوک کا احساس ہی عملی زندگی میں کھینچ لاتا ہے۔

اِدھر اب کئی دن سے اُسے مزدوری نہیں مل رہی تھی۔ اُس نے کئی جگہ جا کر خوشامدیں کیں اور کئی ٹھیکیداروں کے سامنے گڑگڑایا تاکہ ماضی کی تیرگی میں ڈوبے ہوئے دن روشن ہو جائیں مگر مستقبل کی تیز ہوائیں اُمید کی کمزور لو پھڑپھڑا کر بجھ جاتی۔ پھر اس کی بد قسمتی اس مرتبہ فضا میں خنکی بھی زیادہ ہی لے آئی تھی۔ روئیں روئیں میں اس خنکی کا احساس کپکپی پیدا کر رہا تھا۔ سردی سے بچاؤ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے بچے سردی کے موسم میں زیادہ بیمار رہتے اور سسکتے سسکتے خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتے لیکن اس بار اس کے بچے کو بخار چڑھا تو اُترا ہی نہیں۔ اُسے دوا سے زیادہ دُعا کی ضرورت تھی اور دُعا سے زیادہ روٹی کی ضرورت تھی۔

دکاندار نے اُدھار دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ بچّے بلک رہے تھے اور بیوی چُپکے چُپکے روتی۔
ہر قسم کے مواقع سکڑ کر رہ گئے تھے۔ اس سے یہ سب کچھ نہ دیکھا گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے اس کی
خوش نصیبی کی طرح دُور تھی اور کئی دن سے اُس کی پلک تک نہیں جھپکی تھی۔

تلخ حقیقتوں کے نقوش اُبھرتے اُبھرتے اس کے دل میں نہ مٹنے والے داغ بن
گئے تھے اور ان میں اب ٹیسیں سی اُٹھنے لگی تھیں۔ اس کا دماغ گھومنے لگا کیونکہ ذہن اور
حالات کی کشمکش سے کسی طرح اُسے نجات نہیں مل رہی تھی۔ اُسے چاروں طرف سے
مایوسیوں کے سائے پھیلتے نظر آنے لگے اور وہ اس خیال کے کرب سے بلبلا کر رہ گیا
کہ انہی سایوں میں کسی بھی لمحے اس کی، اس کے بچّوں کی، اس کی بیوی کی زندگیاں
گُم ہو کر رہ جائیں گی۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے
لگا اور وہ زندگی کی کٹھن راہ سے پھسل کر مایوسیوں کی گھاٹیوں میں یوں گر پڑا کہ آواز
تک پیدا نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے کہ حالات کے قبرستان میں کوئی نئی قبر اُبھر آئے،
وہ اس قبرستان سے نکل کر زندگی کی طرف لوٹ آنا چاہتا تھا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں چمک
آگئی۔ لیکن ساتھ ہی حلق میں کانٹے سے اُگ آئے۔ بچّوں کی بھوک، بیوی کی سسکیوں اور
اپنی بے بسی کے مِلے جُلے کرب کی چیخ اِن کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔

وہ اُٹھا اور تیز تیز قدم رکھتا سامنے والی مصروف سڑک پر آنے والی تیز رفتار
کار کی طرف بڑھ گیا —!!!

زلیست کی دہلیز پر انسانیت کی پھڑپھڑاہٹ

اُن دونوں نے بھاگتے پیچھے مُڑ کر دیکھا، دُور ان کے گھر سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے اور سامنے بہت سے لوگ کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ سامان کی لُوٹ مار میں وہ لوگ ایسے مصروف ہوتے کہ اُنھیں ان دونوں کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملی اور یہ دونوں موقع غنیمت جان کر چھپتے چھپاتے ان کی نظروں سے بچ کر تیزی سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

اُنھوں نے رفتار دھیمی کر دی کیونکہ ان کا سانس پھُول گیا تھا۔ لڑکی نے اس انداز سے لڑکے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب بھاگا نہیں جا رہا۔ مگر خوف کی وجہ سے وہ ٹھہرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لڑکے نے اس کی ہمت بندھائی اور پیچھے بھاگتے ہوتے خوف کا احساس دلایا۔ لڑکے کے چہرے پر بھی تھکن اور خوف کے مِلے جُلے اثرات موجود

تھے۔ لڑکی کی رفتار دھیمی ہوتے ہوتے لڑکھڑاہٹ پر آگئی تو وہ ایک دم وہیں بیٹھ گئی۔ لڑکے نے اِدھر اُدھر خوف زدہ نظریں دوڑائیں۔ دُکھ انسانیت کے راستوں کے کنارے رکے علاقائی تعصّب کی نفرت کو پاس سے گزرتے دیکھ کر لرز رہے تھے۔ آس پاس کا خوف مساموں کے راستے اس کے جسم میں گھُسنے لگا۔ پھر اس نے لڑکی کے بازوؤں کو پکڑ کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دونوں پھر چلنے لگے۔ جگہ جگہ انسانی لاشیں پڑی تھیں۔ انسان چراغوں کی طرح بجھتے چلے جا رہے تھے۔ اور محض واقعات و احساسات کا تسلسل قائم ہوتا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ مکانات جلے ہوئے تھے اور زمین پر گولہ باری کی وجہ سے بڑے بڑے گڑھے اُبھر آئے تھے۔ درخت کھڑے تھے مگر ان کی شاخوں اور تنوں پر گرد و غبار کی دبیز تہیں جم چکی تھیں۔ فضا میں بارود اور خون کی ایک ناگوار سی بو رچی ہوئی تھی اور چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھی جس نے انسانیت کے ضمیر کو تعصّب کے گِدھوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔ یہ گِدھ انسانوں کا گوشت نوچتے نوچتے اب ان کی رُوح کو اذیّت اور کرب میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔

لڑکی نے چلنے سے انکار کر دیا۔ لڑکا اُسے سہارا دے کر پاس ہی ایک آدھ جلے مکان میں لے گیا تاکہ وہاں سب کی نظروں سے بچکر کچھ دیر آرام کر سکیں۔ اس مکان کا آدھے سے زیادہ حصّہ جل چکا تھا۔ جلنے کی بو ابھی تک آ رہی تھی شاید اُسے جلے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ لڑکے نے پورے گھر میں نظریں دوڑ آئیں۔ خالی صندوق بکھرے پڑے تھے اور پے در پے دھماکوں سے کمروں اور روشن دانوں کے شیشوں کی کرچیاں زمین پر بکھری پڑی تھیں۔ یہ کرچیاں اب دراصل انسانوں کی روح پر گر رہی تھیں۔ جگہ جگہ

خون کی بوندیں اُسے نظر آئیں، اور پھر ایک لمحے کے لئے اس کی روح پر جیسے کوئی بھاری پتھر آپڑا۔ اس کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ اس نے دوسرے کمرے کی چہار دیواری میں ایک ننھا سا بازو کٹا پڑا دیکھا۔ جس میں سے خون ابھی تک رس رہا تھا۔ اس کا وہ احساس بھی مر چکا تھا جس کے ذریعے غم اُبھرتا ہے اور آنکھوں میں آنسو نکل آتے ہیں۔ اس نے اپنے اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کی تاکہ لڑکی اس کی ذہنی اور اندرونی کیفیت کا اندازہ نہ لگا پائے۔ لڑکی نے وہاں فرش پر بیٹھتے ہی کہا۔

"اچھا ہوا کہ تم آگئے تھے۔ ورنہ میں تو تنہا وہاں سے نہ بھاگ پاتی، اور پھر پتہ نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔" یہ کہہ کر لڑکی نے جھرجھری سی لی۔ لڑکے نے جواب دیا "انھوں نے میرے سامنے میری ماں پر چاقوؤں سے حملے کئے۔ میں اپنی ماں کو نہ بچا پایا۔ اس نے میرے سامنے دم توڑ دیا۔ میرے باپ کو پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ چھوٹا بھائی کئی دن سے غائب تھا۔ میں وہاں سے تمہاری طرف بھاگا۔ تم کونے میں کھڑی خوف سے کانپ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بھی تمہارے خوف میں کمی نہیں ہوئی۔ شاید اب کسی سہارے کی ڈھارس بیکار ہی لگ رہی تھی۔"

لڑکی کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے آنسو جیسے خشک ہو چکے تھے۔ اُس نے کہا:

"میں نے اپنی بہن کے ساتھ ان کا وحشیانہ سلوک اپنے سامنے دیکھا۔ تم مجھے گھسیٹتے ہوئے نہ لاتے تو وہ میرے ساتھ بھی وُہی سلوک کرتے۔"

اچانک اس وقت ایک شور سا اُٹھا اور لڑکی نے خوف زدہ ہو کر اپنا چہرہ لڑکے کے سینے میں چھپا دیا پھر خوف کے باوجود فوراً ہی علیحدہ بھی ہو گئی۔ وہ زندگی میں پہلی بار

اس وقت کسی مرد کے اتنے قریب تھی۔ اس کے خاندان میں لڑکیاں کھلے آسمان کو اپنے صحن ہی سے دیکھ سکتی تھیں اور اب تو سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔ نہ وہ مکان تھے نہ وہ لوگ۔ اس کے دل میں اس خیال سے کچھ آسودگی کا احساس ہوا کہ اس وقت وہ اپنے منگیتر کے ساتھ ہی تھی۔ جس سے کم از کم اُسے ذہنی قربت تو تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو اپنے خیالوں میں سجایا تھا۔ ایسے ہی مسرور لمحے جو مُسکراہٹوں میں بسر ہوئے تھے زندگی کی ویرانیوں میں ہمیشہ رفیق بنتے ہیں۔ سب کچھ اجڑ جانے پر بھی زندگی کی تاریکیاں انہی کرنوں سے جگمگا اُٹھتی ہیں۔ یہی زندگی میں روح کی سی پاکیزگی برقرار رکھتی ہیں۔ لڑکے نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:

"یہ ادھ جلا مکان محفوظ جگہ ہے۔ اب اسے دوبارہ جلانے وہ کاہے کو آئیں گے۔ شاید رات یہیں بسر کرنی پڑے۔"

لڑکی کچھ نہیں بولی۔ اس کے کان ہلکی سی آواز پر بھی کھڑے ہو جاتے اور وہ چونکنّی ہو کر گھبرائے ہوئے انداز سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔

"تم نے پتہ نہیں کب سے کچھ کھایا پیا نہ ہوگا۔ اندھیرا ہو جائے تو کچھ انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔" لڑکی کی آواز کسی گہرے کھڈ سے آ رہی تھی۔ "اب تو اپنی جان بچانے کے علاوہ کسی اور طرف دھیان جاتا ہی نہیں....."

لڑکے نے کھڑے ہو کر آس پاس کے علاقے کی طرف نگاہ دوڑانے کی کوشش کی مگر لڑکی نے اُسے زبردستی بٹھا لیا۔ اس پورے علاقے میں وہ کھیل کود کر جوان ہوا تھا لیکن اب ہر گلی،

ہر سڑک، ہر مکان۔ یہ سارا علاقہ ہی اُسے اجنبی لگ رہا تھا۔ جیسے وہ پہلی بار اس طرف راستہ بھول کر نکل آیا ہو۔ ہمدردی اور اخلاق ایسے جذبے انسانیت کے ذہن سے چُن چُن کر دُور سڑکوں پر پھینک دیئے گئے تھے۔ غیر اہم شے کی طرح ان کا ڈھیر اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ محبتوں کے اسی ڈھیر پر نفرت کھڑی قہقہے لگا رہی تھی اور درندگی پھاڑ جیسا منھ کھولے انسانوں کی جانیں اور عصمتیں نگلنے کے لئے منتظر کھڑی تھی۔ وقت اور حالات کے ساتھ احساسات بھی بدل جاتے ہیں۔ ماضی اور اس کے کردار اُن کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ ایک آن میں سب کے سب نے ماضی کے ایسے دُھندلے کرداروں کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ جن پر وقت کی کہر چھا گئی تھی۔

دفعتاً ایک زوردار دھماکہ ہُوا اور مکان ہل کر رہ گیا۔ ساتھ ہی اتنا غبار پھیل گیا۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے اردگرد کی تمام چیزیں اس میں چھُپ گئیں۔ وہ چند لمحے سانس روکے زمین پر پڑے رہے۔ ان کے کپڑوں، بالوں چہروں پر گرد کی گہری تہہ جم چکی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے اوپر سے گرد جھاڑ دی۔

اب شام گہری ہوتی جا رہی تھی اور لڑکی وہاں سے کہیں اور جانے کو تیار نہ تھی۔ لڑکا خود بھی اس بات سے خوف زدہ تھا کہ وہاں سے نکلے تو وہ اُسے دیکھ لیں گے اس خیال سے ہی اس کے جسم میں کپکپی سی طاری ہو گئی۔ وہ وہاں سے نکلتے بھی تو کہاں جاتے۔ ہر آنکھ ان کی تاک میں تھی۔ ہر چہرہ دشمن۔ اچانک ایک بار پھر دُور سے شور اور قہقہوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خوف زدہ ہو کر دیکھا لیکن لڑکے نے لڑکی کو نگاہوں ہی نگاہوں میں ہمت نہ ہارنے کا مشورہ دیا۔ یہ سوچ کر ہی کہ کہیں وہ لوگ انھیں یہاں چھپا ہوا نہ دیکھ لیں۔ وہ دونوں اور سمٹ کر کونے میں دُبک گئے۔ جب شور بالکل قریب آگیا

تو لڑکے نے جلے ہوئے مکان کے ایک سوراخ سے باہر دیکھا۔ چند ننگی عورتوں کو گھیرے میں لئے دس بارہ لوگ قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔ کوئی ان عورتوں کے ننگے جسم کو نوچتا، کوئی بڑھ کر کسی عورت کی چھاتیوں کو مسلتا اور قہقہہ لگاتا۔ کوئی کسی عورت کے بال گھسیٹتا اور وہ گرتے گرتے بچتی۔ کوئی آگے بڑھ کر کسی عورت کے جسم پر چھری کی نوک چبھوتا۔ لڑکے سے زیادہ دیر یہ سب کچھ نہ دیکھا گیا۔ اس کے نحیف جسم میں جھرجھری کی ایک لہر دوڑی۔ وہ چاہتا تھا کہ دوڑ کر جائے اور ان درندوں کو ایک ہی وار میں اُڑا دے۔ اور ان عورتوں کو لباس دے مگر دوسرے ہی لمحے اس کے روئیں روئیں میں خوف سرایت کر گیا۔ اُس نے اپنی غیرت اور حمیت بھی کچلی ہوئی محسوس کی اور وہ اپنے آپ کو بے حس پانے لگا۔ پھر اُس نے لڑکی کے پیلے چہرے کو دیکھا اور سوچا اگر اپنی جان پر کھیل بھی جائے تو پھر اُس کا کیا حشر ہوگا۔ لڑکی نے کونے میں اور سمٹ کر لرزتے ہوئے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے تو لڑکے نے اسے اشارے ہی سے مطمئن رہنے کو کہا۔ اسی اثنا میں باہر بھگدڑ مچنے لگی۔ لڑکی سرک کر لڑکے کے اور قریب ہو گئی۔ لڑکے نے سوراخ سے جھانک کر پھر دیکھا۔ اب سپاہی پہنچ گئے تھے اور ان لوگوں پر لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ وہ لوگ بھاگ نکلے۔ لڑکے کے چہرے پر اتنی دیر کے بعد اطمینان اور خفیف سی خوشی کا تاثر دیکھ کر لڑکی نے آہستگی سے اُس کا سبب دریافت کیا تو لڑکے نے جواب دیا۔

"ہمارے محافظ پہنچ گئے ہیں اور انھیں مار بھگا رہے ہیں۔"

یہ سُن کر لڑکی کے جسم کا لرزہ کچھ کم ہوا۔ لڑکے نے پھر جھانک کر دیکھا۔ اُس وقت سپاہی ان ننگی عورتوں کو مالِ غنیمت سمجھ کر آپس میں بانٹ رہے تھے۔ وہ عورتیں بھی شاید ان کے ساتھ مطمئن انداز میں اس لئے جا رہی تھیں کہ لُٹی ہوئی عصمتیں مزید نہیں لوٹی جائیں گی۔

لڑکے نے نظریں وہاں سے ہٹا لیں۔ اُس نے اس وقت اپنے آپ کو ہر جانب سے غیر محفوظ محسوس کیا۔ شور ختم ہو جانے پر لڑکی نے بھی اطمینان کر لینے کے لئے باہر جھانکا اور آہستہ سے بولی:

"باہر ایک سپاہی کھڑا ہے، اس سے کچھ مدد مانگو۔"

لڑکا چُپ ہی رہا۔ صرف لڑکی کو غیر یقینی انداز میں دیکھا تو وہ بے چینی سے بولی:

"اس سے کچھ پانی مانگو یا کہو کہ ہمیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دے۔"

لڑکے کا حلق بھی خشک تھا۔ وہ اُٹھا اور ڈرتے ڈرتے قدم رکھتا باہر نکلا۔ اُسے اس وقت ان کا خوف نہیں تھا۔ جن کے دل چھوٹے تھے، نفرتیں ان میں سما نہ پا رہی تھیں اور اب اُبل رہی تھیں۔ قدموں کی چاپ سُن کر سپاہی اس طرف متوجہ ہوا اور بندوق کی نوک اس کے سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔

"کیا ہے تمہارے پاس؟"

"میرے پاس تو — تو — کچھ بھی نہیں۔" سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔

سپاہی کی نظر لڑکی پر پڑی تو اس کے کھُردرے چہرے پہ مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

"جھوٹ بولتے ہو .... یہ ہے تو —"

"اس کے پاس بھی کچھ نہیں ...."

"اس کے پاس بہت کچھ ہے۔" سپاہی نے لڑکی کے جسم پر نظر ڈالتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا، اور لڑکے کو دھکیلتے ہوئے لڑکی کی جانب لپکا۔ لڑکا لمحے میں تو رسپاہی کو دھکا دے کر لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے اندھیرے میں بڑھ گیا۔ اندھیرا ہر خوف کو اپنے اندر چھُپا لیتا ہے۔

بڑھتے ہوئے اندھیروں کے ساتھ ساتھ وہ دونوں اب پھر بھاگنے لگے۔ مکانات اور
دکانوں سے اُٹھتے ہوئے شعلوں سے کبھی کبھی آس پاس روشنی پھیل جاتی۔ اور وہ اس روشنی
میں راستے کا تعین بھی کر لیتے۔ بھاگتے بھاگتے لڑکے نے کہا:

"یہ تو وہی بستی ہے جہاں تمہارے ابّا کے بچپن کے دوست رہتے ہیں۔ کیا نام ہے
ان کا۔ تم انھیں چاچا کہتی تھیں۔ ان کا مکان تو دُور ہی سے نظر آجائے گا۔"

اور پھر اس نے مکانات سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا:

"وہ رہا۔ وہاں چلتے ہیں۔ وہ ہماری ضرور مدد کریں گے۔"

وہ دونوں ہانپتے ہوئے اس بنگلے کے پاس پہنچے تو اس کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر بہت سے
لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے اور کوئی انہیں ہدایات
دے رہا تھا۔ لڑکے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک "بچّے" سے چاچا کو بُلانے کے لئے کہا۔ "بچّے"
نے معنی خیز انداز میں ان دونوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بھاگتا ہوا اندر چلا گیا۔
اسی تیزی سے چاچا آئے اور انھیں دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔
اور عجیب انداز میں ان دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ یہ دونوں ہر ہر قدم پر خوف محسوس
کر رہے تھے۔ مگر دل میں کچھ بھروسہ بھی تھا۔ چاچا انھیں کمرے میں چھوڑ کر باہر چلے گئے۔
لڑکا کمرے سے باہر کی سُن گُن لینے لگا۔ کمرے کے چاروں طرف سے زور زور سے باتیں کرنے کی
آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی قہقہے بھی بلند ہوتے۔ یکایک وہ دونوں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ چاچا برابر
ہی کے کمرے میں کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے لہجے میں نفرت اور حقارت کے سوا کوئی جذبہ
نہ تھا۔ ان کی باتیں بخوبی سُنی جا سکتی تھیں۔ لڑکی خوف سے لرزنے لگی۔ چاچا کہہ رہے تھے:

"اُس نے مجھے ہر قدم پر شکست دی تھی، اب میں سارا بدلا اس کی بیٹی سے لُوں گا۔"

لڑکی کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی ردِّ عمل دیکھ کر لڑکا اور پریشان ہوگیا۔ وقت کے بیکراں سمندر میں خوشی، خلوص، محبّت ایسے جذبے کہیں کھو گئے اور ہر جگہ سے نفرت، خطرہ، خوف ابھرنے لگے تھے۔ خوف کی وجہ سے ان میں یہاں سے بھاگنے کی بھی ہمّت نہیں تھی۔ شعور مسلسل خوف سے اب بے حس ہوگیا تھا۔ مگر لاشعوری طور سے ان کے قدم باہر کی جانب اٹھے۔ ان کے پیچھے ہی دو تین لوگ لپکے۔ دونوں اندھیروں میں ناجانے کس جانب نکل گئے۔ یہ سوکھے پتوں کی طرح انسانیت کے کینوس پر ادھر ادھر ڈولتے پھر رہے تھے اور ان کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے لڑکی لڑکھڑا کر گری اور بولی " پانی۔ پانی "

لڑکے کے حلق میں بھی کانٹے سے اگ رہے تھے۔ زبان خشک ہو کر لکڑی کا ٹکڑا بن گئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ شہر اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگر سامنے ہی اسے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ اس نے لڑکی کو کاندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور سہارا دیتے ہوئے اس روشنی کی طرف چل دیا۔ اس نے سوچا چاہے کچھ بھی ہو یہاں سے پانی ضرور پئیں گے۔ وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور لالٹین کی روشنی میں اس نے اندر کمرے میں دیکھا اسلحے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر دروازے پر دستک دی۔ لڑکی بھی اب سنبھل کر کھڑی ہوگئی تھی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور باہر آنے والے آدمی نے چند لمحے انہیں دیکھا پھر آگے بڑھ کر لڑکی کے چہرے پر پھونک ماری۔ کچھ گرد اس کی آنکھوں میں بھی جا گھسی۔ پھر الفاظ چبا چبا کر حیرانی سے بولا:

"چھوٹی بیگم صاحب تم......"

اور انھیں اندر آنے کی جگہ دی۔ لالٹین کی روشنی میں لڑکی نے اس آدمی کو پہچانتے ہوئے کہا:

"ارے سندر تو......"

لڑکی کی آواز میں حیرت اور خوشی کا ملا جُلا احساس موجود تھا۔ سدّو لڑکی کے یہاں کا خاندانی نوکر تھا۔ جوان کے یہاں سے بہت پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔ لڑکے نے جمع شدہ اسلحے کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا: "پانی جلدی سے۔"

سدّو جھٹ پانی لے آیا۔ اور بولا: "بیٹھے بٹھائے میری تو قسمت ہی جاگ گئی۔"

اس کے لہجے کو ان دونوں نے نظر انداز کر دیا۔ لڑکی ایک ہی سانس میں پانی پی کر بولی:

"تیرے ہاں آکر ہم نے خود کو محفوظ محسوس کیا ہے۔"

"اس سرزمین پر تمہارے لیے محفوظ جگہ تو کوئی بھی نہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر ہمیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دے۔"

"میں نے بچپن سے تمہارے ہاں کا نمک کھایا ہے۔ صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ سرحد پار کرا دوں۔"

"ہاں تم یہی کر دو ...." دونوں بول اُٹھے۔

"ایک ایک ہزار لوں گا۔" سدّو نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے چہروں پر مایوسیوں کے سائے لہرانے لگے۔ اپنائیت دُور کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی اور اجنبیت انھیں اندھیرے غاروں میں دھکیل رہی تھی، جہاں مایوسیاں اور دُکھ کانٹے بن کر ان کے جسموں میں چبھ رہے تھے۔

"ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔" سدّو نے عجیب نظروں سے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا۔" لڑکی نے بے قراری سے پوچھا۔

"تم ایک رات میرے بستر پہ گزارو۔ اللہ قسم ـــ" سدّو نے لڑکی کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"نہیں نہیں۔" لڑکی لرز کر رہ گئی۔

"بکواس بند کرو۔" لڑکے نے چیخ کر کہنا چاہا۔ مگر اس کا سارا جسم ہل کر رہ گیا اور صرف کمزور سی آواز اس کے حلق سے نکلی۔ غیر معمولی ردِ عمل کی وجہ سے لڑکی کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ لڑکی کے چہرے کی کیفیت ایسی تھی جیسے کسی خونخوار بلّی نے اس کی کمر پر اپنے پنجے گاڑ دیے ہوں۔ اتنے میں سدّو کو کسی نے پکارا۔ وہ ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی لڑکے نے لڑکی کو سہارا دے کر کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ کھڑکی میں بھی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بے بس نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا کہ سدّو کی آواز برابر کے کمرے سے آئی۔ آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ایک مال پھنس گیا ہے۔" اس نے مزے لے لے کر کہا "رات کو مزہ چکھوں گا۔"

دو تین آدمی ساتھ ہی بولے: "اور ہمارا حصّہ۔"

سدّو بولا۔ "اس کے بعد تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

ان سب کے ملے جلے قہقہے دھواں بن کر انسانیت کے چہرے پر چڑھتے ہوئے حمیّت کے خول پر کالک کی ایک تہہ جمانے لگے۔ پھر ان سب نے مل کر مستی میں چیخنا شروع کر دیا۔ "عورت۔ عورت۔" اور اس سے پہلے کہ حیوانیت کے لمبے ہاتھ بےحرمتی کے لیے اُٹھیں۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر کمزور آواز میں لڑکے سے کہا: — "اس وقت میں اپنے آپ کو تمہارے سپرد کرتی ہوں تاکہ ان جنگلی کتّوں کے پاس کنواری نہ پہنچوں۔"

—— :(❋): ——

سکون

میرے اعصاب کی چیخ میرے دل سے اُٹھ کر میری نس نس میں تحلیل ہوتی، میرے وجود کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر میرے ذہن کے کینوس پر بازگشت بن کر اُبھرتی اور میں اپنی نفسیات کے تھپیڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کی چٹانوں پر اِدھر اُدھر لڑھکتا پھرتا میں ذہنی طور سے لہولہان ہو گیا تھا۔

میں جب آفس سے لوٹا تھا، اس وقت سے مجھے اپنے اوپر رہ رہ کر غصّہ آ رہا تھا، لیکن دانت پیس کر رہ جاتا، تین چار گھنٹوں سے اُلجھتے اُلجھتے اب میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ میرے سر میں ایک عجیب قسم کا شور برپا تھا۔ ذہن پر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے منوں بوجھ لدا ہوا ہو۔ میں نے سر کو جھٹکا دیا اور آنکھوں کی پتلیوں کو گھمایا۔ مگر نہ تو میری کیفیت بدلی نہ میرے ذہن کا بوجھ کم ہوا اور نہ اعصاب کے تناؤ میں کوئی فرق پڑا۔ میں دونوں ہاتھوں سے

سر پکڑ کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد میں نے بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر پٹ کھلی کپڑوں کی الماری کی طرف دیکھا جہاں ہینگروں پر میرے ۲۴، ۲۵ سوٹ لٹکے ہوئے تھے اور گھبرا کر گھڑی دیکھی صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ ٹھیک سات بجے مجھے ایک پارٹی میں شریک ہونا تھا۔ میں تیزی سے الماری کی طرف لپکا اور اسی تیزی سے لپک کر سرمئی رنگ کا سوٹ باہر نکال لیا۔ چند لمحوں بعد میری یہ ساری تیزی خود بخود ختم ہو گئی۔ یہ خیال میرے دماغ کو کرید نے لگا کہ یہ سوٹ ابھی پرسوں ہی آفس پہن کر گیا تھا۔ اب پھر پہن گیا تو دوست کیا سوچیں گے۔ میں نے وہ سوٹ واپس اسی جگہ لٹکا دیا اور ہاتھ نیلے رنگ کے سوٹ کی طرف بڑھائے مگر یہ سوچ کر یکایک رک گیا کہ یہ ابھی تو انور کی شادی کی سالگرہ پر پہنا تھا، دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد میری نظریں چار خانے والے سوٹ پر جم گئیں۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لئے یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ پارٹی کے لئے یہ مناسب نہیں، مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ میں نے سوٹوں کی قطار پر ایک بار پھر نظر ڈالی۔ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھرنے لگیں۔ میں درزی کو بھی گالیاں دینے لگا کہ اگر وہ نیا سوٹ دے دیتا تو آج وہی پہن کر جاتا اور اس گومگو کی کیفیت سے بھی دو چار نہ ہونا پڑتا۔ مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ میں نے پھر گھڑی دیکھی۔ اب صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے آنکھیں میچ کر ایک سوٹ پر انگلی رکھ دی اور خوش ہو کر آنکھیں کھولیں تو جھنجلاہٹ میرے دماغ میں کلبلا کر رہ گئی۔ یہ تو بہت پرانا سوٹ ہے۔ یہ پہن کر گیا تو لوگ ہنسی اڑائیں گے۔

اب پورے سات بج چکے تھے۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ میں یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ کونسا سوٹ پہنوں، میں نے غصے سے الماری کے پٹ بند کئے اور لیٹ کر اخبار دیکھنے لگا۔

بند لبوں کی چیخ

اس وقت مجھے یہ اطمینان ضرور ہوا کہ اب سوٹ منتخب کرنے سے کچھ دیر کے لئے نجات مل گئی ہے۔ تھوڑی دیر سے زیادہ میں اپنا دھیان اخبار کی طرف نہ رکھ سکا کیونکہ یہ احساس میرے ذہن میں گھر کر گیا تھا۔ میں نے سوچا صبح دفتر تو سوٹ پہن کر جانا ہی ہے کیوں نہ ابھی سے وہ سوٹ نکال کر علیحدہ رکھ دوں۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے ذہن کو کسی بوجھ تلے محسوس کیا اور اپنے وجود کو اتھاہ سمندر میں پتّے کی طرح ڈولتے ہوئے پایا۔ دماغ سنسنانے لگا۔ اپنے آپ کو تھکا تھکا محسوس کر کے میں نے صبح تک کے لئے یہ ارادہ بدل دیا اور روشنی گل کر کے لیٹ گیا۔ اندھیرا مہربان ہوتا ہے۔ ہر دکھ، ہر غم، ہر شکست کو اندر سمیٹ لیتا ہے۔

صبح آنکھ جلدی کھل گئی۔ شیو اور ناشتے سے جلدی جلدی فارغ ہو کر میں نے گھڑی دیکھی اور اطمینان کا سانس لیا۔ ابھی کافی وقت تھا۔ میں اپنے لاشعور کی اس الجھن کو دبانے کی خاطر نامہ اخبار دیکھنے لگا۔ دھیان اُسی طرف تھا اور نظریں اخبار پر تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کی مگر یہ کیفیت کم نہ ہوئی۔ آخر الماری کھول کر سامنے جا کھڑا ہوا۔ پہلے میں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے اپنے ذہن کو پرسکون کر کے ایک نظر سوٹوں کی قطار پر ڈالی۔ نظر ہر سوٹ سے پھسل کر دوسرے پر جاتی مگر کسی پر ٹھہر نہ پاتی۔ دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں دُکھنے لگیں۔ گھڑی دیکھی تو دفتر میں وقت کم رہ گیا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر کھونٹی پر لٹکا ہوا پرانا کوٹ اُٹھا لیا اور کسی دوسرے رنگ کی پتلون پہن کر دفتر چلا گیا۔ اس چکر میں تقریباً روز دیر ہو جاتی تھی اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ دفتر میں میرے دوستوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور پوچھا "تم کل پارٹی میں کیوں نہیں آئے۔ تمہارے بغیر مزہ نہیں آیا۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔

جب میں کہیں جاتا تو جانے سے پہلے سوٹ منتخب کرتے وقت اپنی قوتِ فیصلہ کی بہتی ہوئی لہروں کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں مارتا اس ذہنی الجھن کے سمندر کے بیچوں بیچ پہنچ جاتا

اور وہاں پہنچ کر بھری محفل میں بھی میرا شعور، لاشعور سے دست و گریباں ہو کر نفسیاتی کیفیت میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ میں خود اپنے ذہن کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا اور اپنے وجود میں سمٹ کر رہ جاتا۔ اپنی اس تنہائی سے اُداس ہو جاتا اور اس اُداسی کی وجہ سے میں خود اپنے آپ سے ڈرنے لگتا ورنہ میں دوسروں کے ہر معاملے میں جلد اور صحیح فیصلہ کرنے والا مشہور تھا۔ کبھی اس جھنجھٹ سے فرار کے لئے میں کسی پارٹی یا فنکشن میں جانے سے انکار کر دیتا یا کوئی بہانہ بنا دیتا۔ اگر انکار نہ کر پاتا یا کوئی مناسب سا بہانہ نہ بنا پاتا تو وہاں دیر میں پہنچتا میرے پہنچتے ہی لوگ ہنستے اور آوازیں لگاتے۔ میں یہی محسوس کرتا کہ یہ نفسیاتی کیفیت میرے چہرے پر لکھی ہوئی ہے اور سب نے اسے پڑھ لیا ہے۔ یہ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ کسی کے سامنے بیان کر کے مشورہ ہی لے لیتا مجھے اپنی نفسیات کے جو کھٹے میں پھنسے ہوئے قوتِ فیصلہ کے اس آئینے میں اپنا چہرہ مسخ نظر آتا۔ یہ اُلجھن میرے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی اور میں کوئی کام بھی کر رہا ہوتا رہ رہ کر یہ مجھے آ گھیرتی۔ کہیں جا رہا ہوتا تو بھی دھیان اس طرف رہتا۔ دوسروں سے بات کرتے ہوئے گھڑی گھڑی خاموش ہو جاتا اور تصور میں سوٹوں کی قطار آ جاتی اور خود کو الماری کے سامنے کھڑا ہوا پاتا۔ رات کو آنکھ کھلتی تو یہی خیال سب سے پہلے آ موجود ہوتا کہ صبح دفتر کے لئے کونسا سوٹ پہنوں۔ یہ احساس اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ کانٹا بن کر میرے دل میں چبھتا رہتا۔ اس نے زہر کی طرح ذہن و دل دونوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ جب مجھے کسی خاص پارٹی یا فنکشن میں جانا ہوتا تو اس وقت یہ کیفیت اور شدت اختیار کر جاتی۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے بھٹی سے نکال کر لوہے کی سُرخ سلاخ میرے دماغ میں داخل کر دی ہو۔ اسی وجہ سے مَیں نے کہیں آنا جانا کم کر دیا تھا۔ دوست مجھے کریدتے اور قہقہے لگا کر میرا مذاق اُڑاتے۔ میں ان سب کی باتیں سنتا اور خاموش رہتا۔ میرا ذہن تھکا تھکا سا اور اعضاء کمزور ہو گئے تھے جس کا اثر میرے چہرے پر بھی آ گیا تھا۔ میرے چار دن

طرف تاریکی چھائی رہتی اور میں اپنے آپ کو اجنبی سمجھ کر خود اپنے وجود کو تلاش کرتا رہتا۔ میرے قریب ترین دوست میرے باہر نہ نکلنے پر اب سنجیدہ ہونے لگے تھے۔ وہ پریشانی کا اظہار کرتے مگر میں ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کرتا حالانکہ یہ ہنسی کھوکھلی ہوتی۔ میرا ذہن میرے جسم سے علیحدہ لگتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے میرا ذہن باہر نکل کر میرے وجود پر ہنس رہا ہو۔ میں دوستوں کی باتیں رد بھی نہ کرتا جس سے ان لوگوں کے اندیشوں کو اور تقویت ملتی۔ انور نے تو یہاں تک کہا کہ "تم محبت میں گرفتار ہو گئے ہو، محبت انسان کو سنجیدہ بنا دیتی ہے۔" محبت کے لفظ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پروین کا خیال آجاتا۔ پروین کی محبت نے تو میرے لبوں پر قہقہے بکھیرے اور میں بھری محفل میں ہمیشہ نمایاں رہتا۔ اس نے میرے دل میں چپکے سے اتر کر احساس کا دریچہ کھول دیا تھا۔ میں نے اس کی محبت میں آسودگی حاصل کی تھی، میں نے اسے جذبات کی چھوٹی آسودگی کے لئے نہیں چاہا تھا بلکہ لامحدود راحت کے لئے۔ اتنے سارے سوٹوں میں سے کچھ تو پروین کی خاطر اور کچھ اپنے عہدے کی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے سلوائے تھے۔ میں سوچتا کہ لوگ پوری زندگی زندہ رہنے کی تیاریوں میں بتا دیتے ہیں۔ پروین جب کبھی مجھے کسی نئے سوٹ میں دیکھتی تو تعریف کرتے نہ تھکتی اور میں فوراً جا کر ایک اور نئے سوٹ کا آرڈر دے آتا۔ لیکن اب، جب سے اس الجھن نے میرے وجود کو اپنی گرفت میں لیا تھا، ذہن اور جذبات کی کشمکش سے میرے چاروں طرف سائے پھیل جاتے۔ اس بنا پر میں پروین سے ملنے بھی نہ جا سکا تھا۔ وہ خود ہی اس عرصے میں مجھ سے کئی بار ملنے آچکی تھی اور ہر بار شکایت کرتی "تم اب ملنے سے گریز کرنے لگے ہو۔" میں ہکلا کر رہ جاتا۔ پروین جب آتی میرے سوٹوں کی الماری کو دیر تک دیکھتی رہتی، میرے ذوق کی تعریف کرتی اور کہتی "خوش لباسی سے مرد کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔"

ایک روز شام کو بیٹھا میں خود اپنے خیالوں میں بھٹک رہا تھا کہ اس اُلجھن پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے جو میرے ذہن میں چور راستے سے داخل ہو گئی تھی اور مجھے ایک سرد اور تاریک خلا میں معلق کر گئی تھی۔ اسی لمحے پروین آگئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر کے لئے مجھے اپنی اُلجھن سے چھٹکارا مل گیا اور میرے سارے وجود میں جولانی کی لہر دوڑ گئی، چہرے پر خوشی نے جگہ لے لی۔ وہ آئی تو خوشبو کا جھونکا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اس نے ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی، اس کا ہر عضو نمایاں تھا اور اس کا گلابی چہرہ دہک رہا تھا۔ میں بڑھ کر اپنی ناک کبھی اس کے کپڑوں پر رکھنے لگا کبھی اس کے بالوں پر اور کبھی اس کے چہرے کے قریب لے جاتا اور گہرا سانس لیتا۔

"تم یہ عادت چھوڑو گے نہیں۔ میری ساری خوشبو سونگھ لیتے ہو۔"

"ہاں میں تمہارے جسم سے اُٹھتی ہوئی تمام مہک اپنی نس نس میں اُتار لینا چاہتا ہوں۔"

اس کے وجود سے اُٹھتی ہوئی خوشبو کی تپش سے میرے اعصاب جھلسنے لگے۔ یکایک میں ٹھٹھک کر رہ گیا اور اسی اُلجھن نے میرے وجود پر چادر پھیلا دی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں یہ خیال رینگ گیا کہ پروین کہیں ساتھ چلنے کے لئے نہ کہہ دے۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا، اس نے کہا "چلو ایک پارٹی میں چلنا ہے تمہارا بھی بلاوا ہے۔"

میرے وجود کے اندر لرزا سا طاری ہونے لگا، دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اپنی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش میں میرے روئیں روئیں میں چیونٹیاں چلتی محسوس ہوئیں جیسے یہ چیونٹیاں میری ہڈیوں میں گھس جائیں گی۔ میں سوچنے لگا کہ اپنی فطرت کی اس کمزوری سے میں اس وقت پروین کے سامنے دامن نہ بچا پاؤں گا جو میری نس نس میں سرایت کر گئی تھی اور اگر پروین کو اس کا علم ہو گیا تو میری بڑی سبکی ہو گی۔ یہی سوچ کر میں نے کہا:

"تم چلی جاؤ، میرا موڈ نہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

میں ابھی جواب بھی نہ دے پایا کہ پروین نے گھڑی دیکھتے ہوئے بے چینی سے دوبارہ کہا:

"کیا تم اس لئے ہچکچا رہے ہو کہ تمہیں اطلاع پہلے کیوں نہ دی تو بھئی اس میں غلطی میری ہے۔"

میرے چہرے پر کشمکش کی لہریں متلاطم ہو گئیں اور میں ان لہروں میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر لب تھرتھرا کر رہ گئے۔ میں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اور احساسات کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا:

"اچھا شیروانی پہنے لیتا ہوں۔"

پروین بولی "ویسے تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ موڈرن لوگوں کی پارٹی ہے بہتر ہے کوئی سوٹ پہن لو۔" مگر سوٹوں کی الماری کے پاس جا کر میری اس کیفیت میں شدت پیدا ہو گئی۔ ایک خیال کے تحت میں ایک دم خوش ہو گیا اور بولا۔ "آج میں تمہاری پسند کا سوٹ پہنوں گا بتاؤ کونسا پہنوں" یہ کہہ کر میں اپنی عقلمندی پر خوش بھی ہوا۔ پروین نے صرف ایک نظر سوٹوں کی قطار پر ڈالی اور ایک سوٹ نکال لیا۔ میرے جسم میں خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اپنی خوشی چھپاتے ہوئے میں نے پھر پوچھا "اور ٹائی" اُس نے اُسی مناسبت سے ایک ٹائی نکال کر مجھے تھما دی۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی روز اسی طرح سُوٹ نکال کر مجھے دے دیا کرے۔ اُس لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے دُنیا جہان کی خوشیاں میری جھولی میں آ پڑی ہوں۔ اگلے روز دفتر ہی سے میں گھومنے چلا گیا اور رات گئے واپس آیا تو گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا

کہ کپڑوں کی الماری کے پٹ کھلے پڑے ہیں اور میرے سارے سوٹ غائب ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ صبح جلدی میں کھڑکی کی چٹخنی لگانا بھول گیا تھا۔ اتنے قیمتی سوٹوں کے چوری ہو جانے پر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

جس کو بھی معلوم ہوا اُس نے افسوس کیا، پروین بھاگی بھاگی آئی، دیر تک مجھے سمجھاتی رہی اور میری توجہ ہٹانے کے لئے بولی "اب غم کیا کرنا۔ چلو فلم دیکھنے چلتے ہیں"۔

میں جلدی سے اُٹھا اور وہی سُوٹ فوراً پہن لیا جو ابھی ابھی ڈرائی کلینر کے یہاں سے لایا تھا۔ اُس وقت میرے ذہن و دل پر اطمینان ہی اطمینان تھا اور سکون ایک راز کی طرح میرے خون میں اُتر گیا تھا۔

————):(:.:):(: ————

اجنبی خوف کی دستک

باہر سے ہانپتا کانپتا میں گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا کہ جس کی وجہ سے میں گھر میں اس انداز سے داخل ہوا تھا کہیں وہ میرے پیچھے ہی تو داخل نہیں ہو رہا پھر اطمینان کرنے کے لئے میں نے بیوی پر نظر ڈالی اور اپنے اندر کے خوف سے لرزتے ہوئے جسم کو نڈھال انداز میں مسہری پر گرا دیا۔ اس کے بعد اپنے اعصاب اور سانس درست کرنے لگا۔ اس عرصے میں میری بیوی پریشان کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اس میں کچھ پوچھنے کی بھی ہمت نہیں معلوم ہوتی تھی یا شاید اس لئے نہیں پوچھ رہی تھی کہ میں کچھ بتانے کی حالت میں نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے جوتے اُتارے، کپڑے تبدیل کئے اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ غسل خانے میں مجھ پر پھر وہی خوف غالب آ گیا اور میرے اندر صحن پار کر کے کمرے میں جانے

کی ہمت نہیں رہی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں جیسے ہی غسل خانے سے باہر نکلوں گا باہر سے کوئی آکر مجھے دبوچ لے گا۔ جب بیوی گھبرا کر آواز دیتی ہوئی غسل خانے میں ہی چلی آئی تو میں موقع غنیمت جان کر اس کے ساتھ ہی باہر آگیا۔ وہ مجھے سر سے پاؤں تک گھورے جا رہی تھی۔ شاید میرے چہرے سے خوف وہراس کے اثرات ابھی تک نمایاں تھے۔

"آپ پر خوف کیوں طاری ہے۔ کیا ہوا ۔۔۔" جواب دینے کی کوشش میں میرے دل کی دھڑکنیں اور بھی تیز ہو گئیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا جواب سُن کر کہیں میرے ارد گرد موجود کوئی مجھے پکڑ نہ لے۔ یا پھر کہیں میری بیوی ہی حقیقت حال سے آگاہ ہو کر مجھے دھتکار نہ دے۔ مجھے جواب دینے میں ناکام دیکھ کر اُس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور کھانا لینے چلی گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی میری نظریں غیر شعوری طور پر کبھی دروازے پر پڑتیں کہ کوئی اچانک ابھی داخل ہو کر مجھے پکڑ لے گا اور کبھی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتا کہ کوئی مجھے غصیلی نظروں سے نہ جھانک رہا ہو۔

دن چھپنے لگا لیکن دفتر سے آنے کے بعد سے اب تک میں کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ بیوی جب بھی کام سے چند لمحوں کے لئے فرصت پاتی میرے کمرے میں داخل ہوتی اور حیرانی سے مجھے دیکھتی جیسے پوچھ رہی ہو کہ باہر کیوں نہیں نکلتے اور کبھی اس طرح دیکھتی جیسے میں کہیں دھواں بن کر اُڑ تو نہیں گیا ہوں میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے وہم کی تردید کرتا اور اس کے گمان کا مضحکہ اڑانے کی بھی کوشش کرتا۔ کام سے فراغت کے بعد وہ میرے پاس آئی اور میرے سامنے سے رسالہ اُٹھا کر پرے پھینکتے ہوئے بولی۔

"یں آپ تیاری نہیں کر رہے ۔۔۔"

"تیاری ۔۔ کیسی ؟ ۔۔۔"

"رات کو کھانے پر جانا ہے، بھول گئے کیا؟"

میں نے اپنے اندر اتنے لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پائی۔ مجھے یہی گمان رہا کہ سب لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور میری کمزوری پکڑی جائے گی۔ میں ان سب کی نظروں کا مقابلہ نہیں کر پاؤں گا۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے نرمی سے کہا۔

"تم جاؤ میں گھر پر ہی رہوں گا۔"

اس نے تعجب کی نظریں مجھ پر پھینکیں۔

"آپ ہی نے تو یہ پروگرام بنایا تھا۔ کیا ہو گیا ہے آخر؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ میری آواز میں جو خوف شامل تھا وہ اُس نے محسوس کر لیا۔

"آپ کو چلنا پڑے گا۔ آپ کی طبیعت بہل جائے گی۔"

میں اندرونی کشمکش سے دوچار تھا۔ اس کے باوجود میں چاہتا تھا کہ وہاں جاؤں ممکن ہے طبیعت پر اچھا اثر پڑے مگر اندر سے ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ بس یہی خوف تھا کہ میں سب کے سامنے ظاہر ہو جاؤں گا، سب میری کمزوری پکڑ کر لعن طعن کریں گے اور پھر میں کسی کے سامنے منھ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔ مجھے سوچتا دیکھ کر میری بیوی اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال کر جھول گئی۔

"آپ چلیں گے نا۔"

مجھے محسوس ہوا جیسے اسے میری کمزوری معلوم ہے اور وہ بھرے مجمع میں جا کر اسے سب پر عیاں کرنا چاہتی ہے لیکن اس کے باوجود میں انکار نہ کر سکا کہ کہیں وہ میری اندرونی کیفیت پر زیادہ شک نہ کرنے لگے۔ اسی لئے میں نے خوشی سے حامی بھر لی۔ وہ اس قدر خوش

ہوئی جیسے بہت دنوں کی مایوسی کے بعد کوئی خوشی میسر آئی ہو۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ لہجے میں اعتماد کی کمی تھی۔

"رکشہ گھر پر آ جائے تو......"

"ہاں تو جائیے لے آئیے۔"

مجھے یہی شک رہا کہ کہیں وہ اس لئے تو خوش نہیں کہ وہاں جا کر میری کمزوری سب کے سامنے پکڑی جائے گی۔ میں خود ہی اس بات کی نفی بھی کرتا کہ نہیں وہ ایسا نہیں کرے گی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟ جائیے جلدی سے رکشہ لے آئیے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم پڑوس کے بچے کو بھیج کر......" میں بات مکمل نہ کر سکا۔ کچھ لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے خوشامدانہ نظروں سے اُسے دیکھا وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پڑوس میں چلی گئی۔

گھر سے نکلنے کے بعد پہلے میں نے اطمینان کر لینے کے لئے کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر جلدی سے رکشہ میں جا بیٹھا۔ رکشہ والے نے مجھے تعجب اور طنزیہ ہنسی کے ساتھ دیکھا۔ میں نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ بیوی مجھے عجیب نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اب اس کی نظروں میں حیرانی اور پریشانی کے ساتھ اُلجھن بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہاں جا کر جب رکشہ رُکا تو میں بیٹھے بیٹھے کرایہ ادا کر کے اسی طرح دروازے پر جا پہنچا۔ میں رکشہ والے کے تاثرات کے بارے میں قیاس اچھی طرح کر سکتا تھا۔ میری بیوی جلدی جلدی قدم رکھتی ہوئی میرے ساتھ ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے قدم جھجکنے پکڑ لئے۔ باہر لان میں سب لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی چند آوازیں اُبھریں۔

"لو۔ آگئے......"

اور اس کے ساتھ ہی ملی جلی ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے بیوی کو دیکھا، میری نظروں میں اعتماد بالکل نہیں تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ سب ابھی تک میری ہی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ ان کو میری کمزوری کا علم ہو گیا ہے اور میں اب ان کے سامنے چھپا نہیں رہ سکتا۔ اس خیال سے میرے جسم میں جھرجھریاں سی آئیں اور رگوں میں خون کی رفتار تیز ہو گئی۔ میری بیوی نے میرے چہرے کو مددگار نظروں سے دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔

"آگے بڑھئے۔۔۔ سب لوگ کیا کہیں گے۔۔۔"

اور میں اپنے من من بھر کے قدم رکھتا ہوا ان کے نزدیک جا پہنچا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"آپ لوگ اتنی دیر میں کیوں آئے؟" کسی نے پوچھا۔

"دیر۔۔۔ ر۔۔۔ ر۔۔۔ ہیں؟" میں ہکلا کر رہ گیا لیکن فوراً ہی میری بیوی نے جواب دے کر میری مشکل آسان کر دی۔

"انہیں دفتر میں دیر ہو گئی تھی۔ پھر رکشہ دیر میں ملا۔"

"ہاں، ہاں یہی بات تھی۔۔۔" میں نے بھی ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کی جیسے یہ بہت ضروری ہو۔

"آپ تو ہمیشہ بھابی کی ہاں میں ہاں ملاتے آئے ہیں۔"

اس پر ایک ملا جلا قہقہہ بلند ہوا۔ میں نے بھی اس ہنسی میں شامل ہونے کی کوشش میں اپنا منہ کھول تو دیا مگر آواز نہ نکل سکی۔ میرے نزدیک یہ بہت اچھا ہوا کہ فوراً ہی کھانا شروع ہو گیا۔ میں کھانے کے دوران ہر ایک کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتا اور ہر

ایک کو کھانے میں مصروف پا کر اطمینان کر لینے کے بعد میں بھی کھانے لگتا۔ لیکن ہر لمحے مجھے یہی خوف ستاتا رہا کہ کہیں اچانک ان میں سے کوئی بول کر میرے اندر چھپا ہوا چور باہر نہ لے آئے اور کہیں میری ساکھ ختم نہ ہو جائے۔ کھانے کے بعد سب لوگ اُسی طرح پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اور قہقہے بلند ہونے لگے۔ میں ایک کونے میں بیٹھا سب کو باری باری دیکھتا رہا۔

"آج آپ بول نہیں رہے ورنہ آپ تو کسی اور کو بولنے ہی نہیں دیتے"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ میں آپ سب کی باتیں سُن رہا ہوں" ہمّت کر کے مَیں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا مگر یہ کہہ کر اپنے وجود میں مجھے ٹھنڈک سی محسوس ہوئی میں آج واقعی بول نہیں پا رہا تھا اور ان سب کی باتیں میرے کانوں میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح داخل ہو رہی تھیں۔ مَیں اپنے آپ کو زیادہ دیر سنبھال نہ سکا اور وہاں سے اُٹھ کر اندر کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ میرا ذہن سنسنا رہا تھا۔ میرے پیچھے میری بیوی بھی داخل ہو گئی۔

"طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

"ٹھیک ہے — تم جاؤ وہاں باتیں کرو"

میں تنہا ہی اپنے وجود کی بھول بھلیوں میں ہاتھ پاؤں مارنا چاہتا تھا۔

"نہیں — میں اکیلی وہاں کیا کروں گی"

"اکیلی، اتنے سارے تو ہیں —"

"آپ کے بغیر تو میں اکیلی ہی رہتی ہوں"

مَیں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے۔

"پتہ نہیں آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔" اس کے شفاف گالوں پر آنسو ڈھلک آئے۔

"بھئی ٹھیک ہوں ۔۔۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔" میں نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔ میری آواز اعتماد اور یقین سے یکسر خالی تھی اور خود مجھے محسوس ہوا جیسے میں کنویں میں سے بول رہا ہوں۔ میری بیوی کو میرے جواب سے ذرا سا بھی اطمینان نہ ہوا۔ کیوں کہ اس نے میری آواز کی کمزوری اور لہجے کی لڑکھڑاہٹ محسوس کر لی تھی۔ ہم دونوں کو یہاں علیحدہ کمرے میں دیکھ کر کچھ لوگ، آوازیں دیتے ہوئے اسی طرف آ گئے۔

"ارے آپ دونوں یہاں کیوں آ گئے۔؟"

میری بیوی نے آنسو پونچھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ان کی طبیعت کچھ خراب سی ہے۔"

مجھے اپنی آنکھیں اندر کو دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش میں انہیں اور بھی بے ترتیب محسوس کرنے لگا۔ میرے چہرے کے تغیرات دیکھ کر میری بیوی نے اُن لوگوں سے کہا۔۔۔

"دراصل انہیں تنہائی کی ضرورت ہے۔"

اور سب لوگ مجھ پر نظریں پھینکتے ہوئے چلے گئے۔ ان کی نظروں سے مجھے ایسا لگا جیسے انہیں میری اندرونی کیفیت اور خوف کا علم ہے۔ یہ کسی بھی وقت یک آواز ہو کر سب کچھ کہہ دیں گے۔

رات کو جب ہم گھر پہنچے تو میرے ذہن میں یہی اُلجھن تھی کہ میں صبح دفتر جاؤں یا نہ جاؤں۔ جاتا ہوں تو یہ خوف بھی میرے ساتھ رہے گا کہ کہیں کوئی دفتر میں میری کمزوری

نہ پکڑ لے اور نہ جاؤں تو یہ خوف مجھ پر مستقل طور سے کہیں غالب نہ آجائے۔ آخر میں نے دفتر جانے کا فیصلہ کیا۔

دفتر کے لئے رکشہ لینے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ دیر ہو رہی تھی اس لئے میں پیدل ہی چل دیا۔ دفتر کوئی ڈیڑھ، دو میل دور تو تھا ہی۔ میں ادھر اُدھر دیکھتا ہُوا تیزی سے چلتا رہا، کوئی میری طرف دیکھتا تو میں لرز کر رہ جاتا کہ کہیں آ کر وہ مجھے دبوچ نہ لے اور کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا کہ پیچھے سے آ کر اچانک کوئی مجھے قابو میں نہ کر لے۔ دفتر پہنچ کر میں فوراً اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور چھٹی ہونے تک نہیں اُٹھا نہ کسی سے ملا اور نہ بات چیت کی بیچ سوچ کر میں نظریں نیچی کر لیتا اور اپنے آپ کو اپنی ہی نظروں میں گرا ہوا پاتا۔ پھر اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ کام میں معروف رکھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ دو ایک ساتھی میرے پاس آئے اور نہ ملنے کی شکایت بھی کی —

"کیا آج کام زیادہ ہے ؟"

"ہاں — بہت زیادہ —"

اور وہ کچھ بور ہو کر اُٹھ گئے۔ دفتر کا وقت بڑی مشکل سے گزرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے وہاں اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک صدی گزر گئی ہو۔ گھر پہنچا تو میری بیوی نے پُر اُمّید نظروں سے مجھے دیکھا مگر چہرے پر اُڑتی ہوئی ہوائیوں اور گھبراہٹ سے میری اندرونی کیفیت کا اس نے اندازہ لگا لیا۔ میں ابھی آیا ہی تھا کہ بیوی نے بتایا کہ کوئی صاحب آئے ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا کہ کہیں یہ وہی نہ ہو جو آتے ہی مجھے دبوچ لے گا۔ اور پھر سارے محلّے کو میرے بارے میں علم ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ جاؤ۔ جا کے منع کر دو۔ وہ کچھ دیر تو مجھے دیکھتی رہی پھر جا کر پتہ نہیں اس نے کیا جواب دیا۔

میری بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر میری بیوی نے مشورہ دیا کہ میں دفتر سے چھٹی لے لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن ہر وقت میں اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہنا چاہتا تھا کہ کمرے سے نکلوں گا تو کرکری ہو کر رہ جائے گی۔ مجھے بس یہی ڈر تھا کہ باہر کوئی میری تاک میں چھپا کھڑا ہو گا جو مجھے دہکتی ہوئی لال لال آنکھوں سے گھورے گا۔ اس لئے باہر نکلنے کے خیال ہی سے مجھے جھرجھری آجاتی۔ خوف کا بھوت ہر طرف سے اپنے خونیں پنجے لئے نظر آتا۔ یہ دُنیا جو بظاہر اتنی وسیع ہے مجھے تنگ معلوم ہوتی اور میری زندگی خوف کی پتھریلی چکنی چٹان پر تیزی سے گہرائی میں پھسلتی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے لوگوں سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا۔

وقت کا پنچھی اپنی اڑان میں مصروف رہا اور میری چھٹیاں ختم ہوگئیں لیکن میری حالت میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب میں اپنی بیوی سے بھی خوف زدہ رہتا۔ وہ میرے قریب آتی تو میں دُور ہو جاتا اور سوچتا کہیں یہ میری کمزوری نہ اُچک لے۔ وہ چُپکے چُپکے روتی۔ میں اُسے روتا ہوا دیکھتا لیکن اسے تسلّی نہ دے پاتا۔ میں اس کے نزدیک جانے کی کوشش کرتا تو وہی خوف ایسا کرنے سے باز رکھتا۔ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ کل مجھے دفتر جانا ہے وہاں میں وقت کیسے گزاروں گا۔ کبھی سوچتا کہ چھٹی اور لے لوں۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ عین اُسی لمحے کال بیل بجی۔

چند لمحے بعد ایک نوجوان عورت میری بیوی کے ساتھ داخل ہوئی چہرے سے غمگین لگتی تھی۔ ٹھیک اُسی لمحے مجھے پھر وہی جانا پہچانا خوف محسوس ہوا کہ یہ آنے والی عورت میری کمزوری ہی بیان کرنے آئی ہے۔ میری بیوی مجھے تیز اور گہری نظروں سے گھور رہی تھی اور اس کے چہرے پر معنی خیز تاثرات تھے جیسے کہہ رہی ہو کہ اچھا تو تمہاری اس تمام کیفیت کی اصل وجہ یہ عورت ہے۔ میں اپنی بیوی کی ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی ان

نظروں اور اپنے اندر خوف کے احساس کی وجہ سے میں عجیب ملی جلی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ساتھ ہی اُسی خوف کا احساس مجھ پر غالب ہونے لگا اور میرے پورے جسم کے رونگٹیں رونگٹیں میں لرزہ سا طاری ہونے لگا۔

"یہ آپ سے ملنے آئی ہیں"

میری بیوی معنی خیز اور طنزیہ لہجے میں یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اسے آواز دینا چاہتا تھا مگر اپنی خوف زدہ کیفیت کی وجہ سے آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ عورت ابھی تک اُسی طرح کھڑی تھی، میں نے لڑکھڑاتے لہجے میں اُسے بیٹھنے کو کہا اور اسی کے ساتھ یہ بھی احساس ہوا کہ میں جس کی وجہ سے خوف زدہ ہوں اُسی کی خاطر مدارات کر رہا ہوں۔ میں نے اسے پہچاننے کی بڑی کوشش کی، دماغ پر زور ڈالا، اپنی یادوں کے پس منظر پر نظر دوڑائی، شناساؤں کے چہرے یاد کیے۔ اس دوران بھی مجھے یہی محسوس ہو تا رہا جیسے اب میرا دماغ اس خوف کو برداشت نہیں کر سکے گا اور پرزے پرزے ہو کر بکھر جائے گا اور مسلسل میں یہ بھی محسوس کر تا رہا کہ کوئی اب میرے پیچھے سے آکر ابھی ابھی مجھے دبوچ لے گا۔ میں غیر ارادی طور سے کئی بار اپنے پیچھے مڑ مڑ کر ارد گرد دیکھ بھی چکا تھا۔ لیکن وہاں کسی کو نہ پا کر میرے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمایاں ہوتیں اور میرے کپڑوں پر ٹپک جاتیں۔ گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"آپ مظفرؔ صاحب کو جانتے ہیں؟"

"مظفرؔ — ہاں —"

اُسی لمحے میرا دل خوف سے یک دم اُچھلا اور میں نے محسوس کیا کہ جس کا خوف میرے ارد گرد رہتا ہے وہ مظفرؔ ہی ہے جو ابھی کسی کونے سے نکل کر مجھے اپنے دونوں بازوؤں

میں جکڑ لے گا۔ اس وقت میں خوف کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اور مجھ پر لرزہ سا طاری تھا کہ بس ابھی مظفرؔ اور اس کی بیوی دونوں مل کر مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جا کر سب کے سامنے ننگا کر دیں گے۔ میں نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے تاثرات کی جگہ خوشی کے تاثرات لانے کی ناکام کوشش کی۔ اس وقت غیر شعوری طور سے میں نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے اندرونی خوف کو چھپانے کی کوشش میں کہا۔

"مظفرؔ کے کیا حال ہیں، وہ کیوں نہیں آیا؟"

اس کی آواز گلوگیر ہو گئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"وہ سخت بیمار ہیں اور ڈاکٹر نااُمید ہو گئے ہیں۔"

غم کی ایک لہر میرے دل سے اُٹھی اور اس کے لئے ہمدردی کا ایک طوفان اُمڈا لیکن مجھے برابر وُہی خوف کھاتا رہا۔

"مجھے معلوم نہ ہو سکا، افسوس!"

"اس وقت میں آپ کے پاس نہایت مجبور ہو کر آئی ہوں۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو مُسلسل بہے جا رہے تھے جو اس کے کپڑوں پر ٹپک رہے تھے۔ مجھے بھی مسلسل یہی احساس رہا کہ میرے پیچھے سے مُظفرؔ آجائے گا۔ وہ گھڑی گھڑی پہلو بدل رہی تھی اور کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"جی۔ جی کہیے"، میں نے ہمّت کر کے کہا۔ لیکن یہی خوف رہا کہ اب یہ وُہی بات کہہ دے گی جو خوف بن کر میرے لاشعور تک میں گھس گئی ہے اس وقت میرا سانس رُکتا ہُوا محسوس ہوا، جیسے مظفرؔ نے آکر میرا گریبان کس کر پکڑ لیا ہو اور میرے دماغ میں ملے جُلے قہقہے گونجنے لگے۔ جیسے بہت سے لوگ مل کر مجھ پر ہنس رہے ہوں۔

جب وہ جانے لگی تو میرے اردگرد سے ہٹ کر اور میرے اندر سے باہر نکل کر سارا کا سارا خوف اس کے پیچھے ہو لیا۔ ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی تک میرا بال بال جکڑا ہوا تھا اور اب ایک عرصے کے بعد آزاد ہوا ہوں —!!!

——×:(×××):×——

موسم کی ٹھنڈی ہوا اور ہلکی بوندا باندی اُس کے جسم و ذہن پر اثر کر رہی تھی۔ ایسے موسم میں اپنی تنہائی کے لمحوں کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے اُسے ہمیشہ احمد شدّت سے یاد آنے لگتا۔

وہ احمد کے وجود کی طرف اندر تک غیر شعوری طور پر چلتی چلی گئی تھی۔ آدمی آدمی میں ضم ہو جاتا ہے وہ بھی احمد میں ضم ہو گئی تھی۔

اُسے اس وقت اُس پر غصّہ بھی آیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ اس سے ضرور کہے گی کہ یہ ملازمت چھوڑ دے۔ ناممکن بات سوچ کر بھی انسان بعض اوقات کچھ دیر کے لئے سہی طمانیت ضرور محسوس کرتا ہے۔

اپنے ذہن سے پیدا ہونے والی اور اپنے وجود کے گرد تنی اُس بیزاری کو ختم کرنے

کے لئے وہ پھوار سے لُطف اندوز ہونے کے لئے لان میں جا کھڑی ہوئی مگر اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور اپنے آپ کو اور بھی فضول اور خالی خالی سی سمجھنے لگی۔ اندر آکر بھیگے ہوئے بالوں اور کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے بیکار بیکار سی کھڑکی کے پاس کھڑی بلا مقصد باہر دیکھنے لگی۔ اُس نے غیر ارادی طور سے شیلف میں رکھا ہوا کوئی رسالہ اُٹھا کر ورق گردانی کرنے کے بعد واپس وہیں رکھ دیا، پھر کسی سہیلی کا نمبر ڈائیل کرنے کے لئے رسیور اُٹھایا اور ڈائیل کئے بغیر واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ اور کمرے میں بلا وجہ ٹہلنے لگی۔

ملازمہ نے جو کمرے میں چیزوں کی گرد جھاڑ رہی تھی۔ اس کی بے چینی کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟" تو وہ اپنے ہی قدموں پر ڈگمگا کر رہ گئی۔ اور گھبرا کر کہنے لگی۔

"نہیں، انتظار بھلا کس کا۔"

جیسے ملازمہ نے اُس کے اندر جھانک لیا ہو اور اُس کی اُداسی کو اُچک لیا۔ ملازمہ کو گرد جھاڑتے ہوئے دیکھ کر اُسے اپنے ذہن اور وجود پر وہی گرد جمی ہوئی محسوس ہوئی تو اُس نے لاشعوری طور پر اپنے کپڑے جھاڑے۔ اُسے لگا جیسے گرد اُس کے کپڑوں سے اُڑ کر اس کے پورے وجود پر، اُس کی آنکھوں میں، ناک میں گھُسی جا رہی ہو۔ ملازمہ نے اس سے چائے کے لئے پوچھا تو اُس نے یونہی ٹالنے اور پیچھا چھڑانے کے لئے ہاں کر دی۔

ملازمہ کے کمرے سے باہر جانے کے بعد اس نے کچھ زیادہ ہی اُکتاہٹ محسوس

کی۔ اسی اثنا فون کی گھنٹی بجی تو اُس نے بے دلی سے روکھے لہجے میں پوچھا۔

"کون ــــ اچھا انور ــــ ہاں گھر پر ہی ہوں۔ آجاؤ۔"

رسیور رکھ کر اُسے اپنی ساری کیفیت یکسر بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ بے دلی، بیزاری اُلجھن اور اکتاہٹ سب انتظار میں گھل مل گئیں۔ اُسے اپنے جسم کے سمندر میں کھلبلی مچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے انور کے آنے پر غیر شعوری طور پہ بے تحاشہ خوشی کا اظہار کیا۔ انور اُسے تعجب سے دیکھے جارہا تھا۔ وہ کئی سال ساتھ ہی پڑھے تھے۔ مگر انور سے وہ اس طرح گرمجوشی سے کبھی نہیں ملی تھی۔ بس لمحے دو لمحے بات چیت ہوتی اور وہ آگے بڑھ جاتی۔ وہ انور کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے خوب ہنس ہنس کر باتیں کئے جارہی تھی۔ پُرانی باتیں، یونیورسٹی کی باتیں، پرانے ساتھیوں کی باتیں۔ وہ اندر ہی اندر یہ حقیقت بھی تسلیم کررہی تھی کہ ان باتوں میں ٹوٹتی پھوٹتی کسلمند رغبت شامل تھی۔ اس کے عدم اعتماد کے جذبات واحساسات نے اس کے جسم کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ وہ خود ہی خود ڈر رہی تھی کہ کہیں انور کے سامنے پگھل نہ جائے۔ اس لئے بظاہر اس خوف کو دُور کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے لہجے میں انور کو خود ہی بتانے لگی۔

"ان کی نوکری ایسی ہی ہے ایک ہفتہ ہوگیا دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ نہ ان کے جانے کا پتہ نہ آنے کا۔ زیادہ دن میں تنہا ہی گزارتی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ سنجیدہ ہوگئی۔ اُسے اس بار بھی احمد یاد آگیا تھا۔ اب اس تنہائی کے زہر نے اُس کی زبان پر پہرہ بٹھادیا۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ ہمیشہ کی تنہا ہو۔ اسی لمحے بادل زور سے گرجا اور وہ سہم کر رہ گئی۔ وہ محسوس کرتی کہ تنہائی کے ان دنوں میں بادل کچھ زیادہ ہی زور سے گرجتے ہیں، اور گاڑیاں زور سے ہارن بجاتی ہیں اور لوگ اس کے

دروازے پر آکر زور سے چلاتے ہیں ہر آواز پر اس کا دل حلق میں آکر اٹک جاتا۔ اس کا دل اکیلے رہتے ہوئے زیادہ ہی کمزور ہوگیا تھا۔ حالانکہ اکیلے رہنے کے لئے اسے اپنا دل مضبوط رکھنا چاہیئے تھا۔ مگر کوشش کے باوجود وہ محسوس کرتی کہ دل نکلا جارہا ہے اور اعتماد جیسی صلاحیت اس میں نام کو نہیں۔ انور نے اسے سنبھالنے کے لئے اپنے دونوں بازو اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ اس کے حلقے سے نکلنا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے

عین اسی لمحے دروازہ بھی کھلا اور احمد سامنے آگیا جیسے قریب ہی کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ احمد اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ احمد کے سامنے کچھ نہ بول پائی اور نہ صفائی میں کچھ کہہ پائی۔ وہ اعتماد اور عدم اعتماد کے موڑ پر تنہا کھڑی فضا میں معلق ہو کر رہ گئی تھی۔

احمد کے رویئے میں اس کے بعد کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اس سے اسی طرح نرمی محبت اور خوش مزاجی سے پیش آتا۔ مگر اس کے اپنے دل میں ہمیشہ وہم سا ہی جما رہتا اس کے لئے احمد کے رویئے میں نہ غصہ تھا نہ بیزاری نہ کوئی محسوس ہونے والی لچک۔ خود وہ بھی اس واقعے کے سلسلے میں احمد سے کوئی بات نہیں کر پائی۔ کیونکہ کبھی اندر سے کوئی چیز اسے کہنے کو اُبھارتی مگر الفاظ نہ ملتے اور کبھی الفاظ مل جاتے تو اندر سے کوئی منع کرتا۔ اب وہ کہیں باہر جاتا تو سمجھتی کہ وہ اُسے آزما رہا ہے، چپکے سے آکر چھپ کر دیکھے گا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ احمد کو جھنجھوڑ ڈالے، اس کے کاندھے پکڑ کر خوب ہلائے اور چیخ چیخ کر پوچھے۔

"تم چپ کیوں ہو، کیا تمہارے اوپر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا، کیا تم بے حس ہو، تم نے انور کا گریبان پکڑ کر اسے دھکے دے کر کیوں نہ نکالا؟"

اُسے لگتا جیسے اس کا جسم پھٹ جائے گا۔ دماغ اُبل جائے گا۔ اس کے برعکس

احمد کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے چہرے اور لہجے سے پتہ ہی نہ لگتا تھا کہ اس واقعے کا اس پر کوئی اثر ہوا ہے۔ اس لئے وہ ہر پہر لمحے اپنے ہی خیالات کی گرفت میں رہنے لگی۔ وہ یہی سوچتی کہ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ وہ اس طوفان کا انتظار کرتی رہی۔ سوچتی وہ اسے موقع ملتے ہی کڑی سزا دے گا کبھی طلاق کے بارے میں سوچتی، کبھی سوچتی قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہوگا۔ یہ سب کچھ سوچ کر لرز لرز اٹھتی۔

اس کی نفسیاتی کیفیت میں اُتار چڑھاؤ آتے آتے اب شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بال نوچتی، چہرے پر طمانچے مارتی، اس کا جی چاہتا کپڑے پھاڑ کر کہیں نکل جائے لیکن ہر انسان ہر طرف پابہ زنجیر ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں یہ خیال تقویت پانے لگا کہ احمد کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے اور وہ ساکت ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ساری کیفیت اس کے لئے سوہانِ رُوح بنی ہوئی تھی۔ اس کا سر چکر اتا رہتا، عجیب عجیب خیالات دماغ میں کلبلاتے رہتے، کھانے پینے، بات چیت میں اس کا دل نہ لگتا۔ اس ساری اذیت سے چھٹکارا پانے کے لئے رہ رہ کر اس کا جی یہی کرتا کہ احمد اسے ڈانٹے، پھٹکارے، گالیاں دے، مارے، لہولہان کر دے۔

اگلی مرتبہ دورے پر جاتے ہوئے احمد نے اُس سے ساتھ چلنے کو کہا تو اُس نے گھبرا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا جیسے اپنے سکون کے لئے اِدھر اُدھر کے جواز ڈھونڈنے کی بجائے محض احمد کی زبان سے نکلنے والی حقیقت پر قانع رہنا چاہتی ہو۔ احمد کے چہرے کے آئینے میں اسے اپنے چہرے کا تلاطم صاف نظر آ گیا۔ اس سے پہلے تو احمد نے کبھی اس سے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔

"تم تنہا ہی رہتی ہو چلو ذرا تبدیلی ہو جائے گی۔"

وہ تو احمد سے کسی اور ہی رویے کی منتظر تھی، اس سے کچھ اور ہی سن کر اپنے ذہن کی دھند چھانٹنا چاہتی تھی۔ وہ اس متزلزل کیفیت کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے ذہن اور جسم میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں اور یوں لگتا جیسے اب یہ کیفیت اس کے مساموں میں سے پھوٹنے لگے گی۔ اسے لگتا جیسے احمد کی آنکھوں میں سمندر اتر آیا ہے۔ وہ اس دھواں دھواں کیفیت کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اسے بس ایک اعتبار کی ضرورت تھی، اسے اپنے ذہن کے ریگزار کے لئے ایک ساحل کی جستجو تھی۔ کسی آنے والے انجانے طوفان سے خوف زدہ لہروں کو ایک ساحل کی تلاش تھی، وہ اپنے ذہن کے کرچی کرچی آئینے میں اپنا چہرہ صاف دیکھنا چاہتی تھی۔

بڑھتے ہوئے وقت کی خزاں سے اس کے خیال کی کونپل اور بالیدہ ہوتی گئی۔ اس لئے کبھی ارادہ کرتی خود ہی احمد سے پوچھ لے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بھروسہ غیر یقینی کے گہرے پانی میں ڈوبنے لگتا۔ اس کا جواب تو اسے خود ہی معلوم تھا حالانکہ ہزاروں سوال، جواب کے ادراک کے باوجود کئے جاتے ہیں اور پھر وہ احمد سے اتنی میلی بات کے بارے میں پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے تھکے تھکے ذہن میں گزرے وقت کی راکھ چھٹنے لگتی جس کی چنگاریاں آدمی کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیتیں۔

اس کی زندگی کے پُرسکون سمندر میں وہ واقعہ کنکر بن کر آگرا تھا۔ اب اس دن کے بعد سے اُسے اپنی زندگی میں حبس لگتا۔ جیسے وہ محض یہی معلوم کرنے کے واسطے زندہ ہے۔ آدمی ایک لمحے اظہار کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ سوچتی احمد یہ سب کیسے برداشت کر رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ بہت سے جذبوں اور کیفیتوں کے نام نہیں رکھے جا سکے۔ بہت

سے عبارا کبھی تک لفظوں کے پیرہن سے محروم ہیں کبھی سوچتی ان دنوں احمد کے پاس اظہار کے لئے لفظ نہیں رہے۔ احمد کی زبان اور خود اس کی سماعت کے درمیان الفاظ ناچتے رہتے ہوں اور پہنچ نہ پاتے ہوں لیکن یہ خیال آتے ہی اسے مساموں میں ڈوریاں بندھی ہوئی محسوس ہوئیں اور ذہن میں مکڑی کا جالا تنا ہوا لگا کہ احمد کو اس کی کوئی پرواہ نہیں، اُسے اب تک دھوکا ہی دیتا چلا آیا تھا اُسے اس سے محبت ہی نہیں تھی۔ جبھی تو اس پر اس واقعہ کا کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔

یہ سوچ کر اپنا اختیار جو اُس نے ابھی تک بمشکل قابو میں رکھا ہوا تھا اب اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور اسے اپنی سانسیں اپنی نسوں میں سرسراتی ہوئی محسوس ہوئیں!!!

———٭———

بھیڑ میں تنہا ہونے کا کرب

بے مقصدیت کی اُداسی کو چھُپائے جیسے ہی وہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوتی، سُست بیٹھے ہوئے سیلز مین چبھنے والی نظروں کے ساتھ اس کی طرف ایسے لپکے جیسے اونگھتے ہوئے گِدھ بھوکی نظروں کے ساتھ جھپٹتے ہیں۔ اُن کی نظروں کی تیز شعاعیں ان کے جنس کے محدّب عدسے سے گزر کر اس کے جسم پر مرکوز ہو رہی تھیں۔ اسے اپنے جسم پر جگہ جگہ چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوتیں۔ اس کا جی چاہا کہ ان کے منھ پر ایک ایک تھپّڑ رسید کرے لیکن اس کے شعور نے اس کو اس لاشعوری حرکت سے روک دیا۔ احساسات کی گہرائیوں میں سُلگتے ہوئے الاؤ بھڑکنے لگے۔

اس کے ذہن کے احاطے میں جیسے ہوا بند تھی جس طرف ہوا کا دباؤ پڑتا وہ اُدھر ہی ناچاہنے کے باوجود چل پڑتی۔ اپنے آپ کو آزاد ضرور محسوس کرتی لیکن کسی بگولے کے مانند اپنے

وجود میں کبھی کوئی ٹھہراؤ نہ پاتی اور راستے میں ہمیشہ دل ہی دل میں برابر سے گزرنے والوں
کو برا بھلا کہتی، ناک سکورتی، ہونٹ کاٹتی، بڑی چوکنّی ہو کر گزرتی۔ ہر لمحے اسے یہی دھیان
رہتا کہ کہیں اس کے صاف وشفّاف وجود میں کسی جسم کے لمس سے کوئی کالک نہ سرایت کر جائے
جو اس کی پیشانی پر دھبّہ بن کر ہمیشہ کے لئے نمودار ہو جائے۔ اسٹور سے نکلنے کے بعد اسے ساتھ
چلنے والے کے مہذب چہرے کے پردے کے پیچھے انسان کی ابتدائی دور کی درندگی اور حیوانیت
جھانکتی ہوئی نظر آتی۔ انسان ترقّی ضرور کر گیا ہے مگر عورت کے معاملے میں ابھی تک حیوان ہے۔
اس نے غیر ارادی طور پر اپنی پیشانی کو ایک انگلی سے رگڑا اور پھر وہی ہاتھ پتہ نہیں کس تحریک
کی بنا پر حیوانیت کے چہرے پر شرافت کا طمانچہ بن کر جا لگا۔ اس آواز نے غیر محسوس طور پر ادھر
اُدھر جمع ہونے والوں کے جسموں کے گھیرے اور نامعلوم احساسات پر دستک دی۔ اس دستک کا
کا اثر ہر ایک نے مختلف طور پر قبول کیا اور اس کے نتیجے میں اُبھرنے والے سوالات کی بوچھار
سے وہ گھبرا گئی۔ اس نے نظر اُٹھا کر ارد گرد اپنے ہمدردوں کو دیکھا۔ کوئی میٹھی مسکراہٹ اس پر
پھینک رہا تھا، کوئی اسے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا، کوئی
آنکھوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ کوئی الفاظ کے ذریعے اور کوئی محض لب ہلا کر رہ جاتا۔ سب کا
مطلب ایک ہی تھا۔ بس طریقے مختلف تھے۔ لوگوں کی آڑی ترچھی تیز اور چیر دینے والی نگاہیں
چاروں طرف سے اس کے عضو عضو پر پڑ رہی تھیں جیسے وہ ایک کمرے میں ننگ دھڑنگ
کھڑی ہو جس کی دیواروں اور چھت میں جگہ جگہ سوراخوں سے سورج کی شعاعیں اس کے
جسم پر پڑ رہی ہوں۔ اس وقت اس کے اعصاب نے آپس میں گڈمڈ ہو کر اعضا کو شل کر دیا
تھا۔ مجبوری اس کے ذہن پر پنجے گاڑے چپکی بیٹھی تھی۔ وہ وہاں زیادہ دیر ٹھہر کر کسی عریاں فلم کا
اشتہار بنی رہنا نہیں چاہتی تھی اس لئے بچتی بچاتی وہاں سے نکلی تو مختلف قہقہوں نے دور تک

اس کا پیچھا کیا۔ شرافت، حیوانیت کے ہجوم سے بچ نکلنے کے بعد ایک طرف ڈری ڈری کھڑی، گھٹے گھٹے سانس لینے لگی۔ ہر مرد عورت کو سرِ راہ اُگے ہوئے درخت کا پکا پھل سمجھ کر جھاڑ لینا چاہتا ہے۔ اس کے اعصاب پر مختلف احساسات کے تحت کپکپی طاری تھی۔ نزدیک ہی پولیس والے کو دیکھ کر اس کی جانب مدد کے لئے بڑھی تو پولیس والا پُر اشتیاق انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوا اس نے دل ہی دل میں پولیس والے کی فرض شناسی کی داد دی اور اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرنے لگی۔ حیوانیت کو گرفت میں لینے کے لئے جھجکتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش میں اس نے محض اُدھر اشارہ کرنے پر اکتفا کیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا "اپنے آدمی کے ساتھ نکلا کرو"۔

پولیس والے کا یہ لہجہ کرچیوں کی صورت میں اس کے سینے کو چھلنی کئے دے رہا تھا۔ اس نے اپنی صنف کی بے چارگی کی چیخ کو دبا دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ بے بسی اس کے شعور ہی کی نہیں لاشعور کی بھی ہے۔ اس بے بسی کے بوجھ تلے اس کا ضمیر کراہ رہا تھا۔ بے آواز آنسو اس کی روح پر ٹپکنے لگے تھے۔

نظروں کے تیروں سے زخمی اپنے وجود کو اُٹھائے وہ کچھ دیر سُستانے کے خیال سے پاس ہی رضیہ کے گھر چل دی۔ وہاں جا کر اس نے صوفے میں دھنس کر آنکھیں بند کر کے سر پیچھے ٹکا دیا اور گہرا سانس لیا۔ اس کے روئیں روئیں کا کھنچاؤ کم ہوا تو دماغ کے ہر پُرزے کو اپنی اصلی حالت میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو رضیہ نے پوچھا:

"ہاں اب بتاؤ ماجرا کیا ہے"

"وہی جو ہوتا ہے"۔ اس نے چڑ کر کہا اور کھڑے ہو کر ساڑھی درست کرنے لگی۔ "کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوتا"

"نہیں، میں ہمیشہ اپنے شوہر کے ساتھ نکلتی ہوں کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ نظر اُٹھا کر

بھی دیکھے۔ مَیں تو اپنے آپ کو بڑا محفوظ سمجھتی ہُوں ۔"

اُسی لمحے اسے پولیس والے کی بات بھی یاد آگئی۔ اس کے وجود کی گہرائی سے ایک سرد لہر اُبھری اور وہ اس پتّے کے مانند تنہائی محسوس کرنے لگی جو درخت سے گر کر ذرا سی ہوا سے لڑھکنے لگتا ہے اور بے مقصد اِدھر اُدھر اُڑتا پھرتا ہے۔ رضیہ کے اس جملے نے اس کی نفسیات کو جا کھٹکھٹایا تھا۔ لیکن اس قسم کی کیفیت میں اُس کی جھنجلاہٹ بے چین ہو کر ہمیشہ اس کے جسم کے گوشے گوشے میں سرگرداں رہتی۔ اس شدت میں وہ یہ بھی بھول رہتی کہ وقت گزرتے ہوئے راہوں کی خاک اس کے سر پر ڈال دے گا۔ وہ چاہے گی کہ کوئی اس کے دروازے پر آ کر دستک دے۔ پھر انتظار کرتے کرتے آخر خود دروازے پر آجائے گی اور مسافر دُور ہی سے گزرتے چلے جائیں گے۔ اس وقت اس کی زندگی سوائے مرجھائے ہوئے پھول کے اور کچھ نہ ہوگی۔ چاہے گی کبھی تو ماضی کی خوشبوؤں کی ایک ہلکی سی کرن واپس نہیں لاسکے گی۔ رضیہ اس کی یہ اعصابی کیفیت دیکھ کر ہمیشہ کی طرح چُپ رہی۔ عین اسی لمحے رضیہ کے شوہر کو باہر سے آتے دیکھ کر اس کے جسم میں پھر وہی عجیب سی بے چینی اور ذہن پر بیزاری چھانے لگی۔ رضیہ کے شوہر کی چور نگاہوں کے احاطے میں خود اپنے وجود کے دلدل میں پھنسی وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ مرد چاہے کچھ نہ بولے مگر اس کی نظریں سب کچھ کہہ دیتی ہیں۔ وہ مردوں سے خوفزدہ ہونے والی نہیں تھی یہ بھی خوب جانتی تھی کہ مرد عورت کا سب کچھ بگاڑ سکتا ہے اور عورت اس کا کچھ بھی نہیں۔ اس کے شعور اور لاشعور پر چھپٹی ہوئی بے بسی نے ایک بار پھر اس کے اعصاب کو معطل کر دیا اور زبان پر پہرہ بٹھا دیا۔

رضیہ کو چائے کی پیالی تھامے لوٹتے دیکھ کر تنہائی کی سوئیوں کی چبھن جاتی رہی اور وہ اپنی پچھلی حالت پر آگئی بالکل ایسے جیسے موسمی اثرات قبول کر کے تصویر مُڑ کر فریم سے باہر نکل آتی ہے اور موسم کی تبدیلی کے بعد تصویر دوبارہ فریم میں صحیح واپس آجاتی ہے۔ اس وقت وہ بھی اپنے جسم کے فریم میں

سما گئی تھی۔ جلدی جلدی چائے ختم کر کے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے اسے اپنی زندگی بھی اسی خالی پیالی کی طرح لگی۔ اس خیال کے ساتھ ہی ماحول کی ساری خاموشی اس کے ذہن میں اتر آئی۔ نس نس میں گھومنے والی جانی بوجھی اُلجھن، جھنجھلاہٹ اور بیزاری نے سمٹ کر اس کے جسم میں حسبِ معمول ایک طرف دباؤ ڈالا اور وہ بے ارادہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

کئی دن گزرنے کے بعد وہ رضیہ کے ہاں دوبارہ گئی تو اس بار اُس کا شوہر اس کے ساتھ تھا۔ وہ خلافِ معمول نہایت پُر سکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ رضیہ نے اُسے خوشی اور تعجب سے دیکھا۔ رضیہ کا شوہر بھی مبارکباد دینے کے لئے دوسرے کمرے سے آ گیا۔ آج اس کی آنکھوں میں کچھ کہنے والی کوئی بات نہ تھی۔ خود اُسے بھی اپنے جسم میں کوئی بے چینی محسوس نہ ہوئی۔

واپسی پر اپنے شوہر کی معیت میں چلتے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے پاؤں تلے زمین بالکل ہموار ہو گئی ہے۔ اُس نے ایک مانوس خیال کے تحت گھبرا کر اس یقین کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا کہ لوہے کے ذرّات مقناطیس کے اِرد گرد جمع ہو گئے ہوں گے مگر خلافِ معمول سب لوگ اس سے قطعی بے خبر اور لاپرواہ دُور ہی سے گزرے چلے جا رہے تھے اس سے پہلے تک وہ اعتماد کے کھوکھلے ڈھیر پہ بیٹھی اپنے آپ کو ہمیشہ اندھیرے غار میں محیط دیکھتی رہی تھی۔ اب اس کے اعضاء بے جان ہو کر اِدھر اُدھر گرنے لگے۔

اسی لمحے یکایک بے اختیار اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر سب کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔!!

روزِ حشر

مَیں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر سامنے شوکیس میں رکھا اور اردگرد دوسرا چہرہ تلاش کرنے لگا تاکہ اُسے اپنے دھڑ پر سجالوں مگر مجھے وہ کہیں نہ مِلا۔ یہ پریشانی میرے اندر سے اُچک اُچک کر باہر نکلنے لگی کہ اب باہر کیسے نکلوں گا اور سوسائٹی میں کیسے جاؤں گا۔ اس دوسرے چہرے کو شاید کوئی اور اُٹھا کر لے گیا تھا جس طرح میں کسی کا چہرہ لے آیا تھا۔ یہ سوچ کر مُسکراہٹ کی آہ میرے ہونٹوں کے درمیان جگہ بناتی ہوئی سامنے رکھے ہوئے میرے اپنے اصلی چہرے کی آنکھوں میں جا گھُسی اور میرے دل سے نکلے ہوئے خون کے قطرے ان آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکنے لگے۔ علیحدہ رکھنے کے باوجود میرا اصلی چہرہ میرے اندر کی تبدیلیوں کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس احساس کے بارے میں میری یہ سوچیں میرے مساموں سے اُبل اُبل کر میرے چاروں طرف ناچنے لگیں اور میرے اندر سے نکلتی ہوئی گھڑے کی چکنائی

میرے بدن کے انہی مساموں سے رِس رِس کر میرے پورے بدن پر لیپ کرنے لگی۔ سامنے رکھے ہوئے میرے اصلی چہرے کی نظریں اب میرے بدن سے پھسل پھسل کر میرے پاؤں پر پڑنے لگیں تو اپنے اصلی چہرے کی ان نظروں کی چوٹ سے میرے پاؤں دکھن محسوس کرنے لگے۔ میرے پاؤں پیدل چلتے چلتے کھردرے ضرور ہو گئے تھے لیکن تھکن سے کبھی دکھے نہیں تھے۔ اور اب یہ خود میری نظروں کے بوجھ کو نہیں سہار پا رہے تھے۔ میں نے ہیجانی کیفیت میں اپنے پاؤں کو زور زور سے زمین پر پٹخا تو میرے اصلی چہرے پر ہنسی کا زہریلا پن ابر بن کر چھا گیا اور میرے تمام اعضاء الگ الگ ہو کر میرے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔

اپنے ان اعضاء کی غصیلی نظروں سے گھبرا کر میں نے اِدھر اُدھر زمین پر ہاتھ مارے مگر وہ دُوسرا چہرہ مجھے کہیں بھی نہ ملا۔ اب آہستہ آہستہ مجھ سے بھاگے ہوئے میرے اعضاء میرے اندر داخل ہونے لگے لیکن اس کے باوجود مجھے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے ان کے واپس آنے کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے اُس دوسرے چہرے کی تلاش جاری رکھی۔

وہ چہرہ نہ ملا تو پھر ہو گا کیا۔!

یہ سوچ کر گھٹن کے احساس کی وجہ سے میرے اعضاء جن میں سے کچھ اپنی جگہ پر آ گئے تھے اور کچھ اندر سما چکے تھے، اب آپس میں گڈمڈ ہونے لگے اور شوکیس میں رکھا ہُوا میرا اصلی چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ مجبوری کی تھکن مجھ پر اور میرے اعضاء پر گرد بن کر مسلسل تہہ جما رہی تھی۔ یہ سوچتے ہی کہ چوری چھپے باہر جا کر بازار سے ایک اور چہرہ لے آؤں، میں نے فوراً اپنے قدم باہر نکالے اور بھاگتا ہُوا اُسی خاص بازار میں جا پہنچا۔ میری توقع کے خلاف کسی نے میری طرف کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ سب اوپر کی طرف مُنہ اُٹھائے طرح طرح کی آوازیں نکال رہے تھے۔ ان کا ساتھ دینے کے لئے اور بھی برابر شریک ہوتے جا رہے تھے۔

اس لئے ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ لیکن میں ان سے لاتعلق اپنے ہی خول میں محصور اس دکان میں داخل ہوا تو حیرت کے دلدل میں میرے قدم اچانک جا پڑے۔ دکاندار اپنی کھلی دکان میں شوکیس پر سوراخ دار چادر اوڑھے بے خبر سو رہا تھا۔ دکان کے اندر سارے شوکیس اور شیشے کی الماریاں خالی پڑی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ ممکن ہے اس نے بکاؤ چہرے کہیں اندر چھپا کر رکھے ہوں، میں نے اسے جگانے کے لئے رازدارانہ انداز میں اس کا بازو ہلایا۔ اس وقت میرے اندر سے دبی دبی اور گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں جو واپس میرے اندر ڈوبتی بھی جا رہی تھیں۔ وہ ایک دم یوں اٹھ بیٹھا جیسے کسی مشین کا بٹن دب گیا ہو۔ اب میں حیرت کے اس دلدل میں دھنسنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ بھی غائب تھا۔ میرے سوال کرنے سے پہلے ہی اس نے جواب دے دیا جیسے وہ محض جواب دینے کے لئے زندہ ہو، سوال کرنے کا اسے کوئی حق نہ ہو۔

"ایک بھی نہیں بچا"

"مہنگے ہونے کے باوجود!"

"ہاں باہر سے جو لوگ آتے ہیں وہ سب خرید لیتے ہیں"

اس نے میری طرف جملہ اچھالتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر یہاں والوں کا کیا ہوگا"

اس نے اپنے اندر انگلی ڈال کر ایک اور جملہ نکالا اور اسے میرے اندر چپکے سے انڈیل دیا۔

"یہ چھین جھپٹ کر کام چلا لیتے ہیں"

اسی لمحے میں اپنے اندر سے کوئی جواب تلاش کر کے اس کے سامنے رکھنا چاہتا تھا مگر تمام جملے اور الفاظ اس وقت ایک دوسرے پر خونخوار مرغوں کی طرح جھپٹ رہے تھے ـــــ ان میں سے کوئی جملہ باہر آنے کو تیار نہ ہوا۔ شاید اس نے میری اس کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"اب یہ باہر بھیجے جانے لگے ہیں۔"

"باہر —؟ باہر سے تو یہ آتے ہیں۔"

اس نے میرا یہ جواب سن کر گہری ہنکاری بھری اور لیٹ کر اپنے اوپر پھر چادر تان لی۔

"اب کیا ہوگا؟" میں نے چادر سے باہر نکلے ہوئے اس کے پاؤں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ میرے اندر اس سوال کے جواب کی بے چینی کی چنگاریاں اُڑنے لگیں اور میرے وجود کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ کوئی جواب نہ پاکر میں نے اس کا شانہ دوبارہ ہلایا۔

"اب ہوگا کیا آخر —؟"

تو اس نے اندر ہی سے کہا "ان کی جگہ اب نقاب آگئے ہیں۔" میں نے یہ سن کر اس پر اپنے قہقہے کے کنکر پھینکنے چاہے تو اسی لمحے میرے اندر میرے اعضا آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ میں ان کے جھگڑے چکانے کی ہمت نہ ہونے کے خوف کی بنا پر ان کی طرف جان بوجھ کر متوجہ نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ وہ مجھ سے کانا پھوسی کرنے لگا۔

"تمہیں برابر والی دکان سے یہ کم قیمت پر مل جائیں گے۔"

"دائیں یا بائیں —"

"دائیں بائیں دونوں طرف۔"

میں نے اس کا یہ جملہ حیرت سے خود ہی دہرایا مگر دکان سے باہر دیکھ کر مجھے اس سے کہیں زیادہ حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لئے میں نے اس کے جواب کو نظر انداز کر کے اور گھبرا کر باہر دیکھا جہاں چند لوگ اپنے درمیان کھڑے ہوئے کے بدن کو نوچ رہے تھے۔

"یہ سامنے کیا ہو رہا ہے؟"

دکاندار نے مجھے اپنی خاموشی کا طمانچہ مارا تو میں لڑکھڑا کر رہ گیا اور اپنے قدم اپنے ہاتھوں

سے اُٹھاکر دکان سے باہر رکھے۔ اس وقت مجھے خدشہ تھا کہ کہیں میرے نکلتے ہی یہ لوگ یہی سلوک میرے ساتھ نہ کریں۔ مگر بھانت بھانت کے لوگوں کے ہجوم کے سوا وہاں اب کچھ نہ تھا۔ سورج کی حدت سے لوگوں کے جسموں پر چڑھی اضافی چربی کے پگھلنے سے ان کے اندر کی سڑاند فضا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سب اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے۔ میں نے دیکھا دائیں بائیں دونوں دکانوں پر خاصی بھیڑ تھی بلکہ لوگ ہنستے ہوئے بغیر کسی جھجک کے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ میں بھی ان میں سے ایک میں گھس گیا اور بڑی تگ و دو کے بعد ایک نقاب خرید کر خوشی خوشی باہر نکلتے ہوئے میں نے سوچا کہ جاتے ہی شوکیس میں رکھے ہوئے اپنے اصلی چہرے پر اسے چڑھا دوں گا۔ پھر آزادی سے ہر جگہ جاؤں گا۔ ہر آدمی سے مل سکوں گا اور کسی بھی جگہ جاکر بیٹھ سکوں گا۔

اپنے گھر کی دیواروں کے اندر داخل ہوا تو لگا جیسے کسی گہری کھڈ میں داخل ہو گیا ہوں۔ چھت، دیواریں، دروازہ اور کھڑکیاں سب اپنی اپنی جگہ موجود تھیں مگر فرش نہ تھا۔ اس کی بجائے جگہ جگہ زمین میں گڑھے تھے۔ میں نے سوچا یہ گڑھے تو میں نے کہیں اور کھودے تھے۔ یہاں گھر میں کیسے ہو گئے۔ میں اس تبدیلی پر زیادہ غور کرنے کی بجائے شوکیس کی طرف بڑھا جہاں اپنا اصلی چہرہ کچھ دیر پہلے چھوڑ گیا تھا۔

مگر اب وہ وہاں نہ تھا

میں نے ساری چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر انہیں اُٹھا اُٹھا کر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس اُکھاڑ پچھاڑ سے گھبرا کر حیران و پریشان میری بیوی اندر سے نکل کر میرے پاس آئی۔ میرا اصلی چہرہ اس نے لگا رکھا تھا۔ اس پر غصے کی بجائے میں ایک بار پھر حیرت زدہ ہو گیا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے میں گردن گردن دلدل میں کھڑا ہوں۔ خود ہی وہ بولی۔

"پیچھے سے کسی نے آکر اچانک میرا چہرہ اُتار لیا۔ میں نے اُسے پکڑنا چاہا، مگر وہ خود میرے اندر ہی گھس گیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں تمہاری مدد لینے کے لئے اس کمرے میں آئی تو یہاں تمہارا چہرہ رکھا تھا۔"

مجھے اس کی اس تفصیل کے اندر لپٹی ہوئی عریاں حقیقت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"بازار بھی اب خالی ہو گیا ہے!"

"تو پھر اب کیا ہوگا۔"

"پتہ نہیں کیا ہوگا۔"

"اب جو بچا ہے اس کی فکر کرو۔"

"ہاں اس کے لئے ایک نقاب لے آیا ہوں۔"

یہ سُن کر وہ خاموش ہو گئی۔ پھر اس کے قہقہے بتدریج بلند ہونے لگے۔ میں نے لپک کر اس پر سے اپنا اصلی چہرہ اُچک لیا اور میز پر رکھ کر اس پر احتیاط سے وہی نقاب مڑھنے لگا۔ وہ پاس کھڑی دیکھتی رہی لیکن اب وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ گہری سوچ سے اُبھر کر اسنے کہا:

"اس چہرے کو لگا کے محلّے میں نکلتی ہوں کوئی چہرہ مل گیا تو چپکے سے اُٹھا لاؤں گی۔"

میں عدم اعتماد کی پھسلتی ڈھلان پر تنہا کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ میرا اصلی چہرہ لے کر غائب ہو جائے اور پھر واپس نہ آئے۔ اسی لمحے پلک جھپکتے ہی وہ چہرہ اُٹھا کر باہر نکل گئی۔ میرے اندر کے تمام اعضاء باہر نکل کر اس کے پیچھے ہو لئے۔ مگر پھر دروازے سے ہی واپس آ گئے۔ میں نے وقت کو غنیمت جانتے ہوئے سامنے میز پر انہیں سجا دیا، خود پلنگ پر بے فکری سے لیٹ گیا اور اپنی نگاہوں کی تاریکی چاروں طرف پھیلا دی۔

چند ہی لمحے بعد باہر سے مختلف آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ میں نے گھبرا کر اپنے اعضاء کو

اپنے اندر سمیٹا اور خود ہی یہ یقین کر لینے کے بعد کہ یہ میرا کھویا ہوا چہرہ واپس کرنے آئے ہیں۔ خوشی کے عالم میں دروازے کی طرف دوڑا مگر اس جگہ اب دروازہ نہ تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، دروازہ کہیں نظر نہیں آیا۔ تو پھر میری بیوی کہاں سے نکل کر گئی تھی؟ باہر آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو باہر تعجب خیز طور پر مختلف حلیوں میں تین آدمی کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک آواز میں کہا۔

"ہمارے چہرے کہیں کھو گئے ہیں؟"

"لیکن تمہارے چہرے تو موجود ہیں۔"

وہ ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھنے لگے۔ پھر مل کر انہوں نے مجھے دیکھا۔

"یہ دوسروں کے ہیں۔"

"تو یہ چہرے تم کہاں سے لائے ہو۔"

انہوں نے ایک دوسرے کو اسی تعجب سے دوبارہ دیکھا اور پھر مجھے دیکھا۔

"تمہیں اس سے کیا۔"

"جن کے یہ چہرے ہیں وہ تم سے لینے نہیں آئے۔"

"ان پر یہ نقاب"

"اچھا میں سمجھ گیا۔"

میں نے اندر ہی اندر انہیں ویسا ہی پاکر جیسا کہ میں سوچ رہا تھا۔ ایک انجانی خوشی محسوس کی جو بے چینی پر لپٹی ہوئی تھی۔

"ہم تلاشی لیں گے ہمیں اندر آنے کا راستہ بتاؤ۔"

میں نے ان کی بات کو ان سنی اور اپنے سامنے ناچتے ہوئے بہت سے سوالیہ نشانات کو

نظر انداز کرتے ہوئے کہا

"میرا چہرہ بھی تو......"

"جلدی کرو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

"دروازے سے اندر آجاؤ۔"

"یہاں دروازہ نہیں ہے ورنہ ہم تم سے اجازت کیوں لیتے۔" مجھے یاد آیا کہ دروازہ اپنی جگہ نہیں رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟"

"کوئی راستہ بتاؤ!"

"اس کھڑکی سے"

"نہیں یہ تو بلندی پر ہے! کوئی چور دروازہ ہے؟"

یہ کہتے ہی ان کے بدن گھٹتے چلے گئے اور وہ محض بونے بن کر رہ گئے۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا ہوگا؟"

"یہ تو ابھی تک نہیں معلوم۔"

مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دونوں پاؤں پر ورم آگیا ہو۔ میں خود اپنی حالت پر چونک پڑا۔

"یہ معلوم کر کے آؤ کہ اب ہوگا کیا۔!"

یہ سُن کر انہوں نے میری طرف اپنا لعاب اُچھالا جو خود ان پر گرا۔

"اُدھر نالی کا سوراخ ہے اس سے اندر آجاؤ۔"

یہ کہہ کر میں نے جلدی سے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر لئے اور جیسے وہ اسی راستے کی تلاش میں تھے، اس راستے سے ایک کے بعد دوسرا آنے لگا۔ اصل میں ان کا ایک ایک

عضو اندر داخل ہو رہا تھا۔ اندر آ کر ان کے تمام اعضا۔ ان میں واپس چلے گئے اور پھر بڑی جلدی جلدی وہ گھر کی چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگے جیسے کوئی ان کی تلاش میں خود ان کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آنے والا ہو۔ اس دوران میں نے ان کے چہرے غور سے دیکھے تو ان میں سے ایک کا چہرہ وہی دوسرا چہرہ تھا جو میں اپنے گھر میں تلاش کر رہا تھا۔ میں نے فوراً اس پر جھپٹتے ہوئے کہا۔

"یہ چہرہ تم کہاں سے لائے"۔

وہ گھبرا گیا اور میٹھے میٹھے لہجے میں بولا۔

"یہ تو میں نے ایک عورت سے خریدا ہے"۔

عورت کے نام پر میں نے اندر سے جھرجھری لی اور میرے اندر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ میں نے دیکھا وہ خود بھی اندر سے لرز رہا تھا۔ اس کا ثبوت مجھے اس کی پیشانی پر آتے ہوئے قطروں سے ملا۔ ہم دونوں اس کے بعد ایک دوسرے سے چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی اثنا میں میری بیوی بھی اسی نالی کے راستے اندر آ گئی۔ میرا اپنا اصلی چہرہ جو وہ لگا کر گئی تھی، غائب تھا اور اب اس کے ہاتھ میں صرف وہی نقاب لہرا رہا تھا۔ میری بیوی اس آدمی کو دیکھتے ہی میری آستین میں آ کر چھپ گئی۔ اس ڈر سے کہ کہیں یہ لٹکا نہ ڈھا دے اور میرے اندر کی کہانی باہر نہ پھیلا دے میں نے اپنا ہاتھ نیچے لٹکا دیا۔ وہ دھڑام سے نیچے گر پڑی اور وہاں موجود سب پر عیاں ہو گئی۔ اس آدمی نے چلاتے ہوئے کہا۔

"یہی ہے جس نے یہ چہرہ دیا تھا"۔

یہ سن کر میری بیوی اپنے وجود کے عدم اعتماد کے اندھے پن کے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ میں نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ میرا چہرہ کہاں گیا۔ وہ اس کثیف فضا کے بادل چھانٹنے کی کوشش میں لوٹی۔

"تمہارا چہرہ مجھ سے زبردستی چھین لیا گیا ہے۔"

یہ کہہ کر نقاب اس نے میرے اوپر اچھال دی اور کمرے میں پھیلی ہوئی اداسی کو ٹٹولتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

"کیا کریں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کس سلسلے میں ؟"

"کسی بھی سلسلے میں۔"

میں اس آدمی سے کسی طرح وہ چہرہ چھین لینا چاہتا تھا جو میری بیوی نے اسے دیا تھا۔ مگر میری بیوی نے میرے ارادے کو بھانپ کر ان کے ساتھ مل کر مجھے اپنے ہی گھر سے نکال دیا۔ باہر اندھے راستوں کے سوا مجھے کچھ نہ ملا۔

میں وہاں سے بھاگا بھاگا اپنے باپ کے پاس گیا۔ باپ بھائی اور بہنیں میرے چاروں طرف اس طرح جمع ہو گئے جیسے میرا مُردہ جسم ان کے درمیان پڑا ہو۔ ان کے جسموں سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسی خالی ڈبے میں کنکر ڈال کر ہلانے سے آتی ہیں۔ مجھ سے میری کہانی سننے کی بجائے وہ الٹی اپنی اپنی داستان سنانے لگے۔ ان کے پاس صرف ایک چہرہ باقی بچا تھا جو وہ باری باری لگا لیتے تھے اس لئے مجھے اپنی اپنائیت دینے کی خاطر انہوں نے اپنی اپنی نقابیں میری طرف اچھال دیں۔ میرے پاس پہلے ہی ایک نقاب تھی جسے ہاتھ میں تھامے میں وہاں سے پھر بھاگ نکلا ان میں سے کسی نے مجھے نہ روکا اور نہ پیچھا کیا صرف میری بہن نے مجھے جاتے ہوئے کھڑکی میں سے ایک نظر دیکھا اور فوراً پردہ ڈال لیا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن کے تمام اعضاء علیحدہ ہو کر میرے ساتھ بھاگ رہے ہوں۔ راستے میں اسکول سے نکلتے ہوئے مجھے اپنے بچے نظر آئے جو اپنے چہرے لئے ہاتھوں میں اٹھائے میرے ساتھ ساتھ دوڑنے

لگے۔ مجھے چنداں یہ فکر نہیں تھی کہ کہیں کوئی ان کے چہرے نہ لے اُڑے۔ ان کے اندر سے بھی ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں جیسی میرے باپ اور بہن بھائیوں کے جسموں سے مجھے سُنائی دی تھیں۔ میں ان کے قدموں کی گرد اپنے بدن پر پڑتے محسوس کر رہا تھا۔ یہی گرد میری آنکھوں میں گھُسنے لگی۔ کچھ ہی دُور جا کر وہ ایک ایک کر کے مجھ سے پیچھے رہتے چلے گئے اور راستے کی اُڑتی ہُوئی گرد میں اوجھل ہونے لگے تو اُس وقت میرے اعضاء میرے اندر دوبارہ داخل ہو گئے۔ لیکن میں خود اب بھی ان سے علیحدہ ہو کر بھاگ رہا تھا۔

پیچھے رہتے ہوئے راستوں کی پیچھا کرتی ہوئی گرد میرے بدن میں مساموں کے راستے داخل ہونے لگی لیکن میں رُکا نہیں حتیٰ کہ خاموشیوں کی فضا نے دفعتاً مجھے نگل لیا۔ مجھے محسوس ہُوا جیسے میں کسی بے پناہ کشش کے دائرے میں غرقاب سے داخل ہو گیا ہوں۔ میرے اعضاء جن پر اس کشش کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا پیچھے رہ گئے۔ مگر میرے ہاتھ اب بھی میرے ساتھ رہے جو اُس نقاب کو ابھی تک مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کائنات میں پھیلی ہوئی ایک آواز میرے اندر سے یکبارگی اُبھری۔ یہ آواز اُن جانی پہچانی تمام آوازوں سے قطعی مختلف تھی جو میں دُور پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اس لمحے مجھے لگا جیسے میں کوشش کے باوجود آگے نہیں بڑھ پا رہا ہوں۔ اس وقت میں پورے کا پورا آنسوؤں سے تر بہ تر تھا۔ سوا نیزے پر سورج آ جانے سے میرا بدن جھلس چکا تھا اور زبان سُوکھ کر باہر نکل آئی تھی۔ اب مجھے وہاں پہنچ کر پُرسکون ٹھنڈے اور خوشگوار سائے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سمیت وہ نقاب نفرت سے دُور اسی جانب پھینک دیا جہاں سے میں آیا تھا۔ اُسے پھینکنے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے روشنی کے ایک ہالے نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔

میں نے دیکھا کہ میرے سامنے کتبے کی جگہ وہاں میرا اپنا اصلی چہرہ نصب تھا ــــ!!!

ــــ >:(:-:):< ــــ

بند لبوں کی چیخ

طاہر نقوی کی شخصیت اور فن کو گرفت میں لانے کے مرحلے سے گزرنے کے لئے میں اپنے ذہن کے خیالات اور الفاظ کے اسلحہ خانے کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک قول یاد آیا اور اب میں اُس میں اضافہ کرتے ہوئے یوں عرض کروں گا کہ اگر آدمی دل زندہ رکھتا ہو تو زندگی کو آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سُنا، ذہن سے سوچا اور بند لبوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

طاہر نقوی کی ذات اور افسانہ نگاری انہیں عناصر سے عبارت ہے۔ اُن کی طبیعت میں ایسی سلامت روی ہے کہ اُن کا سروش، غلط آہنگ نہیں ہوتا۔ آپ طاہر کے اِن افسانوں میں اندازِ بیان اور روایت کے طریقوں کے تنوع کی ایک دُنیا دیکھیں گے۔ جدید تنقید کی اصطلاح کے مطابق تکنیک کا تنوع ہے مگر میں نے افسانہ نگار کو "فوکس" کرتے ہوئے بات باندازِ دیگر کہی ہے۔

اس وقت افسانہ نگار کئی گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ طاہر نقوی نے زندگی کو مکمل طور پر گرفت میں لینے کے لئے اپنے آپ کو کسی گروہ کے سپرد نہیں کر دیا ہے۔ وہ افسانہ نویسی کے قدیم اسلوب اور تکنیک سے لے کر ضد افسانہ اور بیانیہ کے ذریعے انسانی ذات میں لمحوں کے سفر کی داستان بیان کرنے کے سفر تک ـــــ کئی مرحلے سر کر چکے ہیں اور آج ہمارے اُن افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے اردو افسانے کو زماں و مکاں اور اظہارِ ذات کی چوتھی سمت بھی عطا کر دی ہے، جواب سے پہلے ممنوعہ تو نہیں تھی مگر نادریافت ضرور تھی ـــــ "لمحوں کے سر سراتے کیڑے" اس سفر کے دوران اُن کی "آنکھوں میں گھس گئے" اور اُن کے "چاروں طرف اندھیرا چھا گیا"۔ اپنے وجدان کے تحت انہوں نے اپنی ذات کے سورج پر ہاتھ رکھ کے اُسے آن کیا، روشنی اندھیروں سے جیت گئی اور اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بند لبوں کی چیخ" اسی فتح کا اعلان نامہ ہے۔ طاہر کے لئے دعا ہے کہ

ہر لحظہ نیا شوق نئی برقِ تجلی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی